''راکھ'' اور ''نادار لوگ'' کے افسانوی بیانیوں کا تقابلی مطالعہ

محقق

سید رخسار شاہ

رجسٹریشن نمبر: 103-FLL/MSURDU/S-13

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

شعبہ اُردو، کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اُردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

9/1/2020
Acc. TH21438

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم فل/پی ایچ۔ڈی اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور Ph.D/MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **''راکھ'' اور ''نادار لوگ'' کے افسانوی بیانوں کا تقابلی مطالعہ**

مقالہ نگار: رخسار شاہ

رجسٹریشن نمبر: 103-FLL/MSURDU/S13

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر منورا قبال احمد
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

ڈاکٹر نعیم مظہر
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
نمل، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر شیراز فضل داد
لیکچرر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر حمیرا اشفاق
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

جنوری، 2018ء

اقرار نامہ

میں، سید رخسار شاہ حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ،اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا اور میرا یہ مقالہ سرقہ سے پاک ہے۔

(سید رخسار شاہ)

مقالہ نگار

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۸ء

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ **رخسار شاہ** رجسٹریشن نمبر:**103/FLL/MSURDU/S13** نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان **'' 'راکھ' اور 'نادار لوگ' کے افسانوی بیانیوں کا تقابلی''** مطالعہ برائے ایم ایس اردو، میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

کلیہ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست ابواب

		صفحہ نمبر
	پیش لفظ	i
باب اول:	اردو ناول میں افسانوی بیانیوں کی روایت :ایک جائزہ	۱
باب دوم:	ناول راکھ میں اہم افسانوی بیانیوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ	۴۱
باب سوم:	ناول نادار لوگ میں اہم افسانوی بیانیوں کا تجزیہ	۷۲
باب چہارم:	ناول راکھ اور نادار لوگ کے افسانوی بیانیوں کا تقابلی مطالعہ	۱۱۲
	مجموعی ماحصل	۱۴۵
	کتابیات و ماخذات:	۱۵۹

پیش لفظ

''راکھ'' اور ''نادار لوگ'' اپنے تاریخی بیانیوں کے حوالے سے دیگر تاریخی ناولوں کے مقابلہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں تاریخی واقعات کو جس انداز میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ اور عبداللہ حسین کے ناول نادار لوگ میں نمایاں کیا گیا ہے شاید ہی اس کے مقابلے میں کسی اور ناول میں اتنی وضاحت اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا گیا ہو۔ نادار لوگ اور راکھ میں جن واقعات کو بیان کیا گیا ہے ان پر بہت سے اور ناول نگاروں نے بھی بہت کچھ لکھ ڈالا مگر جو منظر کشی راکھ اور نادار لوگ میں کی گئی ہے اس کو ادب کے میدان میں بہت سے ادیبوں نے نہ صرف سراہا ہے بلکہ ان ناولوں کو ایک شاہکار گردانہ ہے۔

راکھ اور نادار لوگ کے افسانوی بیانیوں کا تقابلی مطالعہ کا موضوع میری نہایت ہی قابل احترام استاد ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کے مشورے پر منتخب کیا گیا۔ اس کام کے دوران جوں جوں آگے بڑھتا گیا مجھے دونوں ناولوں کا پس منظر اور زمانہ اپنی طرف مزید متوجہ کرتا گیا۔ کیونکہ ان دونوں ناولوں کے بیانیے قیام پاکستان کے حالات وواقعات کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دونوں شخصیات نے اپنے ناولوں میں ان حالات وواقعات کو قوم کے سامنے نمایاں اور خاص طور پر نئی نسل کو ان سے واقف کروانا قومی اور ملی فریضہ سمجھا ہے۔ یوں یہ مقالہ تحریر کرنا ایک قومی اور علمی فریضہ ادا کرنے کے مترادف اور اس سے بھی بڑھ کر میرے خوش قسمتی ہے کہ میں نے انتہائی اہم موضوع پر کام کیا۔

دوران مقالہ میری کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح مستنصر حسین تارڑ اور عبداللہ حسین سے باضابطہ طور پر ملاقات ہو لیکن عبداللہ حسین کی علالت اور مستنصر حسین تارڑ کی مصروفیت کی بنا پر ملاقات نہ کر سکا۔ اس کے باوجود مقالے سے متعلق تمام مواد کو انتہائی جانفشانی سے اکٹھا کر لیا اور پاکستان کی مختلف لائبریریوں خاص طور پر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری، دعوۃ اکیڈمی کی لائبریری اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری میرے لئے انتہائی معاون ثابت ہوئیں۔ علاوہ ازیں میں شعبہ اردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی پروفیسر عبدالعزیز ساحر صاحب کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے سنٹرل لائبریری سے متعلقہ ریکارڈ تک میری رسائی کو انتہائی خوش دلی سے ممکن بنایا۔ زیر نظر مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اردو ناول میں افسانوی

بیانیوں کی روایت کا جائزہ اور اس جائزہ کے ضمن میں بیانیہ اور افسانوی بیانیہ کا تعارف دیگر ناول نگاروں کے ناولوں میں بیانیہ اور افسانوی بیانیوں کی موجودگی پر تفصیلاً بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ناول راکھ میں اہم افسانوی بیانیوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ کے ساتھ ساتھ ناول راکھ کے مختلف افسانوی واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ باب سوم ناول نادارلوگ میں موجود اہم افسانوی بیانیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ دراصل عبداللہ حسین نے نادارلوگ میں افسانوی بیانیوں کے مختلف واقعات کو پراثر اور حقیقت پسندی کے قریب لانے کے لیے اکثر وبیشتر مکالموں سے کام لیا ہے۔ باب چہارم میں راکھ اور نادارلوگ کے افسانوی بیانیوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تقابلی جائزہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان دونوں ناولوں کے بیانیوں میں کس حد تک ان تاریخی واقعات کے درمیان یکسانیت اور کس حد تک ان بیانیوں میں افسانوی رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے کہ جس سے ایک قاری مکمل طور پر مطمئین ہوسکتا ہے یا کسی حد تک قاری کی اصل حقائق تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ میں اپنے تمام محترم اساتذہ کرام جنہوں نے کورس ورک کے دوران اور بعد میں مقالے کی نوک پلک درست کرنے میں میری ہر ہر لمحہ انگلی پکڑ کر رہنمائی کی، میں سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ان محترم اساتذہ کرام کا بھی جن میں ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم) جن کا ذکر کرنا میرے لیے باعث فخر ہے کیونکہ ان کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کی دی گئی رہنمائی سے مستفید ہو رہا ہوں، خدا ان کے درجات بلند فرمائے (آمین) دیگر اساتذہ کرام جن سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ان میں پروفیسر رشید امجد، پروفیسر ڈاکٹر مجیب احمد، ڈاکٹر اسماعیل گوہر، ڈاکٹر سید اکمل حسین شاہ شامل ہیں۔ میری طالب علمانہ کاوش صاحبان فکر ونظر کے سامنے کس مقام کی حامل قرار پائے گی یہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہی بہتر جانتی ہے یا صاحبان نقد ونظر تاہم میں نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ یہاں میں اپنی مقالے کی نگران ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود جب جب میں نے ان سے رابطہ کیا انہوں نے مجھے وقت دیا اور تحقیق کے کھٹن مراحل طے کرنے کا سلیقہ سکھایا بلکہ میرے موضوع کے ضمن میں کچھ نایاب مواد جو میرے مقالے کے لئے انتہائی ضروری تھا رسائل اور عکسی نقول کی صورت میں مجھے بذریعہ ای میل روانہ کیں۔ دنیا میں انسان کے ہر کام کی تکمیل میں اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت کے بعد کسی نہ کسی طرح والدین کی دعاؤں کا ضرور دخل ہوتا ہے۔ والدین کی دعاؤں کا میں ہمیشہ مقروض رہا ہوں جنہوں نے ہر مشکل مرحلے میں میری ہمت بڑھائی۔ ان کے ساتھ ہی میں اپنی شریک حیات (کنول رخسار) کا بھی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے علم وادب کی اس منزل پر تنہا نہیں چھوڑا۔ بلکہ مقالے

کی تکمیل وتسوید کے دور آن میں ہر طرح کی سہولت اور آرام پہنچایا اور ساتھ ہی ساتھ میری حوصلہ افزائی بھی کرتی رہی اور آخر میں میں اپنے انتہائی قریبی دوست محمد اسحٰق خان کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے بڑی جانفشانی سے اس مقالے کو کمپوز کیا۔ مستنصر حسین تارڑ اور عبداللہ حسین جیسے بلند قامت ناول نگاروں کے ان گوہر نایاب ناولوں کے بیانیوں پر مقالہ تیار کرنا ایک مشکل کام تھا۔ کام کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی دامن گیر رہا کہ اس کام کو اسی پائے کا ہونا چاہیئے جیسے ان ناول نگاروں کا مقام ہے۔ تصویر کی خوبصورتی میں تب ہی نکھار اور دلکشی آتی ہے، جب اس کا فریم بھی مناسب اور دیدہ زیب ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کاوش محض طالب علمانہ ہے اور اس میں مزید بہتری کی ضرورت اور گنجائش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ اللہ کرے کہ میری یہ تحقیق تربیت (Research Training) علم نافع کے طور پر آئندہ کے لیے مفید ثابت ہو۔ (آمین)۔

سید رخسار شاہ

ایم ایس سکالر

باب اول

اردو ناول میں افسانوی بیانیوں کی روایت: ایک جائزہ

افسانوی بیانیہ کیا ہے؟

زندگی سے جڑا کوئی شعبہ نہیں جس میں بیانیہ کا عمل دخل نہ ہو۔ بیانیہ سے ہی معاشرتی کوائف و روابط، نیک و بد، صحیح و غلط کی پہچان اور ثقافتی رویوں کے معیار طے ہوتے ہیں۔ بیانیہ نہ صرف کسی معاشرے میں انسانی رشتوں کے نظم وضبط کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ فطرت اور ماحول سے انسان کے روابط کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے میں حسن، حق اور خیر کے معیار اس سے طے ہوتے ہیں اور عوامی دانش وحکمت بھی اسی سرچشمے کی دین ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی بھی ثقافت میں معاشرتی کوائف وضوابط اور معاشرتی رویوں کی تشکیل وتہذیب جس سرچشمہ فیضان سے ہوتی ہے وہ بیانیہ ہی ہے۔ بیانیہ جس حد تک انسانی زندگی کے ساتھ جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ آخر یہ بیانیہ ہے کیا اور یہ معاشرے کے کس کس حصے کو متاثر کرتا ہے یا زندگی کا کون کونسا شعبہ بیانیہ سے متاثر ہوتا ہے۔

افسانوی بیانیہ سے مراد بیان کا وہ طریقہ ہے جو افسانوی ادب میں ادیب اپنی کہانی سنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں کہانی بیان کرنے والے کا تعلق کہانی کے کرداروں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ جس سے ادیب کی کہانی سے وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔

بیانیے کے کئی طریقہ کار ہیں یعنی کہانی بیان کرنے والا، کہانی کا کردار ہوسکتا ہے، کہانی کو بیان کرنے والا خود ہوسکتا ہے یا کوئی بھی تیسرا جو کہانی کو قاری تک پہنچا رہا ہوتا ہے۔ مثلاً وہ پہلا شخص جو خود کہانی سنائے۔ دوسرا شخص جو خود یا کوئی قاری اس کہانی کا مرکز ہو اور تیسرا وہ شخص کہ جب کہانی سنانے والا کسی تیسرے آدمی کے بارے میں بات کرتا ہے۔ بقول معین الدین جینا بڑے:

> ''کہانی جو نظم یا نثر میں کہی یا سنائی جائے جو مبنی بر واقعات، کردار ہوں ان واقعات کا اپنا ایک تسلسل ہو اور وہ کردار گفتار وعمل کے متحمل ہوں، چاہے وہ حکایت، قصے یا داستان کی شکل میں ہو۔ افسانے، ناول اور مثنوی کے روپ میں ہو یا پھر ڈرامے اور نظم کے بہروپ میں ''بیانیہ'' کہلاتی ہے''۔(۱)

اسی طرح ادبی شخصیات نے اپنے تجربات اور مشاہدات اور محسوسات کی بنا پر بیانیہ کی مختلف تعریفیں

کی ہیں جن کی وجہ سے بیانیہ کو سمجھنے اور اس کے مختلف دیگر فنون کے ساتھ تعلق کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بقول ممتاز شیریں:

''بیانیہ صحیح معنوں میں کئی واقعات کی ایک داستان ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے
علی الترتیب بیان ہوتے ہیں''(۲)

ممتاز شیریں کے اس قول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیانیہ در اصل کسی تحریر یا فن پارے میں کوئی واقعہ یا مختلف واقعات کی ایک ترتیب ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے تہہ در تہہ کھلتے ہیں۔ بیانیہ اسلوب میں مصنف کسی واقعہ،قصہ ،مطالعہ یا مشاہدے کو حکایتی یا کہانی کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ بیانیہ میں مصنف کوئی واقعہ یا قصہ کرداروں ، مکالموں یا مختلف مناظر کے ذریعے پیش کر سکتا ہے یا پھر وہ کسی فن پارے میں بیانیہ تیار کرنے کے لئے داخلی خود کلامی Internal Monologue کا سہارا بھی لے سکتا ہے۔ اگر بیانیہ ایک طرف اکہرا ، رومانوی یا حقیقت پسندانہ ہو سکتا ہے تو دوسری طرف اس میں علامت اور تجرد کا استعمال بھی جائز ٹھہرتا ہے۔ بیانیہ سے فکشن کا پورا تانا بانا تیار ہوتا ہے جس کے لئے کہانی ایک جز یا حصے کی حیثیت رکھتی ہے جو بمعنی Story line کے بیانیہ میں جاری رہتی ہے اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔

دوسری طرف گوپی چند نارنگ بیانیہ کے لیے وقت کی قید کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بیانیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ماضی سے تعلق رکھتا ہو اور وہ کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

''حال اور مستقبل میں Imperfectiveیعنی پیرایہ دیکھنے والی نظموں
(شاعری) میں زیادہ تر بیانیہ نہیں فقط بیان ہوتا ہے''(۳)

گوپی چند نارنگ کے نزدیک بیانیہ میں وقت کی اہمیت صرف نظموں یا شاعری میں ہی نہیں بلکہ ہر بیانیہ چاہے وہ نثر میں ہو یا نظم میں، اس میں وقت کی اپنی اہمیت ہے جہاں فن پارے میں ماضی بطور وقت ہوگا وہاں بیانیہ کی گنجائش زیادہ ابھرتی ہے۔ بہر حال یہ بات اپنی جگہ لیکن بیانیہ کا اصل دارومدار قصہ یا کہانی پر ہی ہوتا ہے۔ جہاں واقعہ ،قصہ یا کہانی کا عمل دخل ہوگا وہاں زیادہ سے زیادہ بیانیہ کی کارفرمائی ہوگی۔ شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نازک فن ہے جبکہ بیانیہ ٹھوس واقعیت اور ذہنیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کے نزدیک بیانیہ نہ صرف افسانوی ادب تک محدود ہے بلکہ غیر افسانوی ادب میں بھی

اس کا پورا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہ بات کہ افسانوی ادب کے مقابلے میں غیر افسانوی ادب میں حقیقت پسندی کا عمل دخل کسی حد تک زیادہ رہتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول:

> ''بیانیہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس میں جو واقعات بیان ہوں وہ لامحالہ فرضی ہوں اگر یہ شرط لگائی جائے تو بہت سے ناول اور افسانے بھی بیانیہ کی سرحد سے باہر ٹھہریں گے۔''(۴)

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیانیہ کو واقعات سے غرض ہے چاہے واقعات فرضی ہوں یا سرتا سر حقیقت پر مبنی ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ واقعات کب، کہاں اور کیسے اخذ کیے گئے ہیں ۔اگر بیانیہ پر فرضیت کی شرط مسلط کی جائے تو نہ صرف غیر افسانوی ادب بلکہ بہت سے ایسے ناول اور افسانے ہماری نظر سے گزریں گے جن میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے یا پھر سچ اور جھوٹ کو کچھ اس قدر گھلا ملا کر پیش کیا گیا ہے کہ اس میں جھوٹ اور سچ کی تمیز اور فرق کرنا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سی بات ہے۔ان کے علاوہ ہمارے سامنے کئی ایسے اسلوب بھی ہیں جن میں واقعہ کو بیان نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ہمارے سامنے کرداروں کے ذریعے اور مختلف مناظر کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے کیا ان کو بیانیہ کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے یا نہیں۔مثلاً فلم، ڈرامہ، رقص خاص کر وہ رقص جس میں کوئی واقعہ یا واقعات موجود ہوتے ہیں مثلاً کتھک اور بیلی ڈانس وغیرہ۔اس بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں:

> ''ظاہر ہے کہ ان تینوں (فلم، ڈرامہ، رقص) میں بیانیہ کا عنصر موجود ہے بعض میں کم تو بعض میں زیادہ''(۵)

اگرچہ فیچر فلم میں بیانیہ عنصر کی کارفرمائی بظاہر بہت کم نظر آتی ہے لیکن یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ کوئی بھی فیچر فلم ہو اس میں نہ صرف کرداروں کے ذریعے بہت سے واقعات دکھائے جاتے ہیں بلکہ زبانی مکالمے کے ذریعے بہت سے واقعات پڑھے یا بیان کئے جاتے ہیں کچھ ایسا ہی معاملہ تقریباً ڈرامے کے ساتھ بھی ہے۔ جہاں واقعہ یا واقعات زبانی مکالمے کے بجائے کرداروں کے ذریعے اور مختلف مناظر کے ذریعے سامعین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔فیچر فلم اور ڈرامے میں بھی کہیں نہ کہیں واقعہ کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ زندگی سے جڑا کوئی شعبہ نہیں جس میں بیانیہ کا عمل دخل نہ ہو

لیوتار علم کے دو حصے بیان کرتے ہیں ایک کو وہ سائنسی علم کہتے ہیں اور دوسرے کو بیانیہ لیوتار کے نزدیک سائنس اور بیانیہ دو روایتی حریفوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں ہمیشہ سے ہی تضاد اور کشمکش کا رشتہ رہا ہے لیوتار یہ بھی کہتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے یلغار کے باوجود بھی بیانیہ کا وجود ضروری ہے۔ بلکہ اس سے اور آگے لیوتار کہتا ہے کہ بیانیہ صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت ہے جس میں متھ، دیو مالا، اساطیر اور قصہ کہانیاں شامل ہیں۔ بلکہ ان کے نزدیک فلسفہ کی روایت بھی اس بیانیہ کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ لیوتار ایک جگہ لکھتے ہیں :

> ''بیانیہ سے ہی معاشرتی کوائف و روابط ، نیک و بد، صحیح و غلط کی پہچان اور ثقافتی رویوں کے معیار طے ہوئے ہیں۔ بیانیہ نہ صرف کسی بھی معاشرے میں انسانی رشتوں کے نظم و ربط کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ فطرت اور ماحول سے انسان کے روابط کا بھی مظہر ہوتا ہے کسی بھی معاشرے میں حسن، حق اور خیر کے معیار اس سے طے ہوتے ہیں اور عوامی دانش و حکمت بھی اسی سرچشمے کی دین ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی بھی ثقافت میں معاشرتی کوائف وضوابط اور معاشرتی رویوں کی تشکیل و تہذیب جس سرچشمہ فیضان سے ہوتی ہے وہ بیانیہ ہے۔''(۶)

لیوتار کے بیان سے یہ بات تو ظاہر ہو جاتی ہے کہ بیانیہ کا عمل دخل نہ صرف فکشن تک محدود ہے بلکہ حیات انسانی سے جڑا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں بیانیہ کا عمل دخل موجود نہ ہو نیز یہ کہ بیانیہ پورے انسانی معاشرت اور ثقافت پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس سے معاشرے میں صحیح و غلط کا پتہ چلتا ہے اور نیک و بد کی پہچان بھی اسی سے ہوتی ہے یہاں تک کہ انسانی ثقافتی رویوں اور اصولوں کے معیار بھی یہی بیانیہ طے کرتا ہے۔ بیانیہ کی اسی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے "فیڈرک جیمز "نے کہا تھا کہ:

> ''بیانیہ اتنا ادبی فارم نہیں جتنا یہ ایک علمیاتی زمرہ یا ساخت ہے۔ زندگی کی حقیقت ہم تک اس زمرے میں ڈھل کر پہنچتی ہے یعنی ہم دنیا کو بیانیہ کے ذریعے سے ہی جانتے ہیں یہ سوچنا بھی محال ہے کہ دنیا کا کوئی تصور بیانیہ سے ہٹ کر ممکن ہے''(۷)

دیکھا جائے تو فیڈرک جیمز کا یہ بیان کہ ہم دنیا کو بیانیہ کے ذریعے سے ہی جانتے ہیں سراسر حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ ہزاروں سال پرانی روایت جو ہم تک پہنچتی ہے۔وہ انہی قصہ کہانیوں ،لوک روایتوں کے ذریعے سے ہی پہنچتی ہے یعنی انسان کا اٹھنا بیٹھنا، رہن سہن ،چال چلن ، پہناوا غرض انسانی زندگی سے جڑا ہر ایک پہلو، ہر ایک چیز ہم تک ان ہی قصہ ،لوک روایتوں وغیرہ سے پہنچتا ہے جو بیانیہ کی اصل روایت سے جڑی ہیں اور جن میں ہزاروں سال قدیم روایتی بیانیہ کے نقوش ہی نہیں بلکہ پوری تصویر نظر آتی ہے۔

ہزاروں سال پرانی ان روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بیانیہ فکشن کا ایک ناگزیر حصہ ہے جس کے بغیر فکشن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن جدیدیت کے آتے آتے فکشن سے بیانیہ کا اخراج شروع ہوا۔ساختیاتی مفکر ژرار ژینت(Gerard Genette) لکھتے ہیں کہ"نئے فکشن کے آتے آتے بیانیہ" مصنف کے اپنے ڈسکورس میں ڈوب گیا، فکشن میں قصہ کے بجائے کردار نگاری پر زور ،مصنف کی جابجا مداخلت اور اپنے تاثرات بیان کرنے سے فکشن میں واقعہ یا قصہ کی اہمیت کم ہوتی گئی۔فکشن سے واقعہ دور ہونے کے سبب بیانیہ بھی تنزل کا شکار ہوا یا یوں کہیں کہ فکشن سے آہستہ آہستہ غائب ہوتا گیا یہاں تک کہ بعض حلقوں کی جانب سے بیانیہ کی موت کا اعلان بھی جاری کیا گیا۔

ڈاکٹر قمر رئیس کے مطابق فکشن میں آہستہ آہستہ تبدیلی کے آثار رونما ہونے لگے اور فکشن نگاروں کا ذہن جدیدیت کی فیشن پرستی سے آزاد ہوکر نئی فضا میں سانس لینے لگا۔سوچ اور فکر نے نئی کروٹ لی اور فکشن میں بیانیہ کی واپسی کے امکانات پھر سے ظاہر ہونے لگے ۔ اب فکشن میں کردار کی جگہ قصہ یا واقعہ کو پھر سے اہمیت دی جارہی ہے جو روایتی بیانیہ کی شان تھی۔جیمز کے نزدیک کردارنگاری بیانیہ کی اصل روح ہے اور کہانی یا واقعہ ہمیشہ کرداروں کے تابع ہوتے ہیں۔ جیمز تو یہاں تک کہتا ہے کہ کسی فن کار کو صرف اپنے کرداروں پر نظر اور مکمل پکڑ رکھنی چاہئیے چاہے اس کے لیے فنکار کو واقعہ اور محاکات کو دبانا ہی کیوں نہ پڑے۔ کرداروں کے ساتھ ساتھ کہانی یا قصہ اپنے آپ آگے بڑھتا اور پروان چڑھتا جائے گا۔حالانکہ جیمز کے یہ تصورات ہماری صدیوں پر پھیلی ہوئی بیانیہ کی قدیم روایت کے برعکس ہیں دراصل جیمز جس بیانیہ کی پاسداری کررہے ہیں وہ ہماری روایتی بیانیہ کا حصہ نہیں ہو سکتے۔جبکہ ان کے برعکس تاڈا روف کی نظر صدیوں پر پھیلی ہوئی بیانیہ کی روایت ہے جس میں قصہ یا واقعہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جہاں کردار کی اہمیت ثانوی ہے اور ہر کردار واقعہ کا تابع ہوتا ہے جس نظریہ کی پاسداری زیوتان تاڈا روف (Tzvtan

(Todoror کررہے ہیں وہ بیانیہ کی اصل روایت سے جڑا ہوا ہے۔ تاڈاروف کے نزدیک قدیم روایتی بیانیہ میں ہنری جیمز (Henry James) کی کردار نگاری کے برعکس قصہ یا واقعہ ہی وہ چیز ہے جس کے اردگرد کردار مکالمہ منظر نگاری پروان چڑھتے ہیں اور یہ سب چیزیں قصہ یا واقعہ کے تابع ہوتے ہیں۔ دراصل ان چیزوں کا وجود ہی قصہ یا کہانی سے قائم ہے۔یعنی واقعہ جو بیانیہ کی اصل روایت ہے کیونکہ واقعہ ہی بیانیہ کا اصل پیرایہ ہے۔جبکہ گوپی چند نارنگ ایک جگہ لکھتے ہیں :

''بیانیہ تو فکشن کی زینت ہے کہانی اس کا جز ہے بمعنی Story Line کے جو بیانیہ میں جاری رہتی ہے یا جس سے پلاٹ بُنا جاتا ہے یا جو کرداروں یا واقعات یا مکالموں یا مناظر کی تشکیل کرتا ہے''(۸)

یعنی بیانیہ میں ایک کہانی ہوتی ہے جس کے اردگرد پھر سارا ماحول تشکیل پاتا ہے کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے اور اس کہانی کے اردگرد پھر پلاٹ، کردار، مکالمہ، مناظر وغیرہ کی خمیر تیار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں کہانی کے لیے معاون ضرور ہیں لیکن بنیادی اہمیت قصہ کی ہی ہے۔کہانی کے ساتھ ساتھ یہ چیزیں بھی چلتی رہتی ہیں اور سب مل کر بیانیہ کی تشکیل کرتے ہیں۔

بیانیہ کی روایت اگر چہ ہزاروں سال پرانی ہے تاہم یہ کبھی ماہرین کے درمیان موضوع بحث نہ بن سکا اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی خاطر خواہ کام ہو سکا لیکن ساختیات کے منظر پر آنے سے بیانیہ کی تھیوری پر حالیہ برسوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں تک کہ بیانیہ اب ساختیات کا ناگزیر حصہ بن چکا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''معنیاتی نقادوں نے بیانیہ پر بہت توجہ صرف کی ہے شاید اس توجہ کے باعث بیانیہ کی تنقید اور اس کے نظریاتی مباحث یعنی بیانیات (Narratology) کو جدید تنقید میں اہم ترین مقام حاصل ہے''(۹)

بیانیہ کی تھیوری پر کام کرنے والے اولین بنیاد گزاروں میں روسی مفکر ولادمیر پروپ کو اولیت کا مقام حاصل ہے ۔ پروپ بنیادی طور پر ہیئت پسندی سے تعلق رکھتا تھا انہوں نے روسی ہیئت پسندوں کی دین کا پورا فائدہ اٹھایا اور بیانیہ کے ساختیاتی مطالعہ کی سمت میں ایک اہم قدم اٹھایا ۔ان اقدامات کے باوجود

تاڈاروف بیانیہ کو انسانی زندگی سے وابستہ کرتا ہے اور یہاں تک کہتا ہے کہ انسان کے لیے بیانیہ زندگی ہے اور عدم بیانیہ موت۔

بیانیہ پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ ژرار ژینت لکھتے ہیں:

''بیانیہ کتنا ہی خالص کیوں نہ دکھائی دے، فیصلہ کرنے والے ذہن پر پرچھائی ضرور در آتی ہے۔ اس اعتبار سے بیانیہ ہمیشہ غیر خالص ہوتا ہے''(۱۰)

جدید دور میں اب فکشن میں بیانیہ کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور ماہرین کے درمیان اب بیانیہ ایک اہم اور دلچسپ موضوع بن چکا ہے اور اس پر کام بھی ہو رہا ہے جو بیانیہ کی تھیوری کے لیے ایک خوش آئند قدم ہے۔ تاہم جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے۔ یہاں بیانیہ کے حوالے سے آج بھی کم کام ہوا ہے۔ بیانیہ اسلوب کے حوالے سے اردو میں آج تک جو بھی کام ہوا ہے وہ تقریبا ناہونے کے برابر ہی ہے۔ ہمارے نقاد و محققین حضرات نے اس جانب کچھ کم ہی توجہ دی ہے۔ اردو کی بات کریں تو آج تک جو تھوڑا بہت کام ہوا ہے اس کا سہرا صحیح معنوں میں گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کو جاتا ہے۔ان ادبی شخصیات نے بیانیہ اور افسانوی بیانیہ کی تھیوری کے حوالے سے کچھ کام ضرور انجام دیا ہے۔ان کے علاوہ جن ادبی شخصیات کے ادبی فن پاروں میں بیانیہ پر کام دکھائی دیتا ہے ان میں سے عبدالحلیم شرر، قراءۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین اور مستنصر حسین تارڑ وغیرہ کے افسانوں میں افسانوی بیانیوں کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔اگر چہ اردو میں بیانیہ کے حوالے سے جو کام ہوا ہے وہ زیادہ نہیں اور نسبتا مشکل بھی ہے مگر پھر بھی کافی حوصلہ افزا اور امید افزا کہا جا سکتا ہے۔امید ہے آج تک اردو میں افسانوی بیانیہ کے حوالے سے جو بھی کام ہوا ہے وہ آگے چل کر نئی نسل کے نقاد و محققین کے لیے رہنمائی کا کام انجام دے گا اور نئی پود کے لکھنے والوں کو پرانی روش سے ہٹ کر بیانیہ جیسے پیچیدہ مسائل کی طرف راغب کرے گا جس سے آگے آنے والے وقت میں افسانوی بیانیہ کی تھیوری پر اردو میں زیادہ اور بہتر ڈھنگ سے کام انجام دیا جا سکے گا۔

اگر دیکھا جائے تو بیانیہ کہانی کی جان ہے۔اسی حصہ پر کہانی کا دارومدار ہوتا ہے یہ حصہ جتنا اچھا ہوگا اتنی ہی کہانی جاندار ہوگی۔مکالموں کے جاندار اور شاندار ہونے کی وجہ سے ہی کردار خود بخود گفتگو کرتے

ہوئے دکھائی دیں گے غرض کہانی کی مرکزی حیثیت کو قائم رکھنے میں یہ حصہ کام آتا ہے۔اس حصے میں ہم قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔کیا کہنا ہے کیا چھپانا ہے سب اس حصے میں شامل ہے۔کہانی کہنے والے کو قاری کے جذبات ،خیالات کا لحاظ بھی رکھنا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ قاری کی دلچسپی بڑھانے کے لئے تجسس اور آگے کیا ہوگا والی کیفیت میں بھی رکھنا ضروری ہے تا کہ کہانی آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ قاری کو اپنی گرفت میں بھی رکھ سکے۔

تقریبا تمام کہانیوں میں مکالمے،بیانیے ،تشریح اور خیالات شامل ہوتے ہیں لیکن تمام کی تمام کہانیاں ایک جیسی بھی نہیں ہوتیں دیکھنا یہ ہوگا کہ اگر مکالمے اچھے ہیں تو پھر ان کو استعمال کریں اور ساتھ ہی ساتھ اگر ان مکالموں میں اتنی جان ہے کہ یہ لڑائی ،مار کٹائی کے مناظر اچھے بیان کر سکتے ہیں تو پھر وہ ضرور بیان کرنے چاہئیے۔اسی طرح اگر کہانی میں تجسس برقرار رکھتے ہوئے اس حصے میں مزید اچھا لکھ سکتے ہیں تو پھر یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے،اس دوران تجربات سے گھبرانے کی بجائے اس کا مقابلہ کرنے اور اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرنے کی لگن ہونی چاہئیے۔

افسانوی بیانیوں کے مختلف طریقوں کا استعمال کسی بھی کہانی کو بیان کرنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔اگر کوئی پہلی دفعہ لکھنے کی سعی کرتا ہے تو اس صورت میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئیے اور دوسری مرتبہ پڑھتے ہوئے مزید بہتری لانے کی کوشش کرنی چاہئیے۔کہانی بیان کرتے ہوئے اظہار کے مختلف طریقے استعمال کرنے ضروری ہیں تا کہ یکسانیت نظر نہ آئے اور کہانی قاری کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کر سکے۔

بیانیوں کے مختلف انداز میں استعمال کرنے سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ کونسا بیانیہ انداز کس کہانی یا پھر کس کردار کے ساتھ بہتر ہوگا۔اس سے بیانیہ انتہائی بہتر اور پر اثر دکھائی دے گا اور کہانی کہانی نہیں بلکہ حقیقت معلوم ہوگی جس سے قاری کی دلچسپی اور تجسس میں مزید اضافہ ہوگا۔اسی طرح ان مختلف اندازیا طریقوں کا ادغام بھی ضروری ہے۔اس کے بعد اگر مضمون کے آخری حصے میں بیانیے کے مختلف طریقوں پر ایک بحث کی جائے تو کہانی مزید بہتر ہوسکتی ہے۔پھر دوسری جانب کہانی کے واقعات کے پیش کرنے کا انداز کیا ہونا چاہئیے کہ جس سے قاری لطف اندوز ہو سکے۔آیا ان واقعات کو جلدی جلدی قاری

کے سامنے آنا چاہئیے یا تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ اور ان کو سامنے لاتے وقت کن کن باتوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔یعنی طوالت و اختصار میں سے کس کا استعمال ضروری ہے اور اس بات کی طرف بھی دھیان ہونا چاہئیے کہ کردار اپنے ساتھ گفتگو کرتا ہے اور کیسے ،کس انداز میں یہ گفتگو کی جاتی ہے۔اس کے بعد کردار کے خیالات اور اس کی خود کلامی میں فرق کن کن باتوں کا ہوسکتا ہے۔اور کسی کہانی کے منظر کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے اور کیوں دی جاتی ہے آخر کن وجوہات پر انکی اہمیت یہاں ضروری سمجھی جائے۔یہ ساری باتیں تفصیلا ذہن نشین رہنی چاہئیے۔

اگر چہ کہانی کہنے کے کئی انداز اور طریقے ہو سکتے ہیں جیسا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان انداز اور طریقوں کے استعمال سے کہانیاں اسالیب کے اعتبار سے انتہائی اعلیٰ وصف کی حامل ہوتی ہیں۔یعنی اگر کسی ایک طریقہ سے آپ کامیاب نہیں ہو رہے تو پھر دوسرا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ اور یہی افسانوی بیانیے کی اصل روح ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت:

اردو ناول نگاری میں افسانوی بیانیوں کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر جاتا ہے۔اردو زبان کی ادبی تاریخ میں ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک اہم مقام ہی نہیں بلکہ انہیں اردو کا پہلا ناول نگار بھی کہا جاتا ہے۔ افسانوی ادب کے میدان میں نذیر احمد کے کارناموں کی ایک مستقل حیثیت ہے۔نذیر احمد چونکہ سرسید احمد خاں کے خیالات سے متاثر تھے اس لیے ان کا بنیادی جھکاؤ بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے ذریعے مسلم سماج کی اصلاح کی جانب تھا۔اسی لیے نذیر احمد نے اپنا ناول ''مراۃ العروس'' خاص طور پر اپنی بیٹی کے لیے لکھا تھا۔

بقول گوپی چند نارنگ

> ''مراۃ العروس کے بیانیوں میں سچی ازدواجی خوشی، وفاشعاری،ایثار ومحبت اور خانہ داری کے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی ہے۔جبکہ توبۃ النصوح میں نظم وضبط کی سختی سے پابندی پرزور دیتا ہے۔توبۃ النصوح کے بیانیوں میں غیر فرمانبردار کلیم کو اپنی حکم عدولی کی سزا کے طور پر گھر چھوڑنے کے بارے میں اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کی ہے''۔(۱۱)

مصنف نے اگر چہ صرف سات ناول لکھے ہیں مگر ان سات ناولوں نے ناول نگاری کے میدان میں اس دور کے دیگر ناول نگاروں کے فن ناول نگاری کی تخلیق میں ایک واضح فرق ڈال دیا ۔اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے ناول مراۃ العروس سے افسانوی بیانیوں کی روایت چل نکلی۔مراۃ العروس کے افسانوی بیانیوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان بیانیوں کے ذریعے سے تہذیب و اخلاق کی اصلاح ہونا ،بالخصوص مستورات کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح سے متعلق کتابوں کا سرے سے ہی فقدان تھا۔ڈپٹی نذیر احمد نے اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ بچیوں کی تعلیم و اصلاح بھی ضروری سمجھی۔اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول مراۃ العروس میں دہلی کے ایک متوسط شریف مسلمان خاندان کی کہانی کو افسانوی بیانیے کی شکل میں پیش کرتے ہوئے اس خاندان کے طرز معاشرت کی ہو بہو عکاسی کر کے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح خواتین اپنی توہم پرستی، جہالت اور کج روی کی بناء پر ہمیشہ رنج والام کا شکار رہتی ہیں ۔ اسی ناول میں دو بہنیں اصغری و اکبری ممتاز کردار کی مالک ہیں۔ یہ دونوں عادات و کردار طور و اطوار میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے افسانوی انداز اپناتے ہوئے دونوں کرداروں کی تصویر ہو بہو معاشرے کے مطابق کھینچی ہے۔جس سے فکر و عمل کے دو زاویوں کا تقابلی مطالعہ پیش نظر ہو جاتا ہے۔ اگر چہ اردو ناول نگاری لگ بھگ اپنے ڈیڑھ سو سال کی عمر پوری کر چکی ہے اور نذیر احمد کے ناولوں پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ منتشر اور مختصر اوراق یا سطور کی شکل میں ملتا ہے۔ اور جیسا بھی لکھا گیا ہے اس سے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول نگاری کے فکری اور فنی پہلوؤں کی وضاحت نہیں ہوتی اور نہ ہی انکی شخصیت اور فن کے باہمی تعلق پر تاریخی اور ادبی تسلسل کے ساتھ روشنی پڑتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے سب ناولوں کے موضوعات کا تعلق کسی نہ کسی معاشرتی مسئلے سے ہے جسے ڈپٹی نذیر احمد نے ناولوں میں مختلف بیانیوں کی صورت میں پیش کیا ہے ۔ یہ معاشرتی مسائل ڈپٹی نذیر احمد کی اپنی زندگی اور ہم سب کی زندگی کے تجربوں ،نظریوں اور اصلاحی اعمال و افکار سے متعلق ہیں ۔ان ناولوں میں ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت و انفرادیت کی چھاپ صاف صاف نمایاں ہے۔ ہر ناول کوئی نہ کوئی اصلاحی مقصد رکھتا ہے جو ان ناولوں کے مختلف بیانیوں اور کہانیوں کی شکل میں دیکھی جا سکتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان ناولوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات ، کالج کی تعلیمی زندگی کے اثرات ،علی گڑھ کی تحریک اصلاح، سرسید سے رفاقت اور نظریاتی اختلاف مگر اصلاحی پروگرام میں اتحاد و اتفاق یہ سب ملکر

ناولوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

''مراۃ العروس'' پہلی ہی بار چھپ کر شائع ہوئی تو جو نقشہ اس میں عورتوں کی اخلاقی حالت کا کھینچا گیا تھا اسکو دیکھ کر سرسید نہایت رنج ہوا اور وہ اس کو مسلمان شرفاء کی زنانہ سوسائٹی پر ایک قسم کا اتہام خیال کرتے تھے'' (۱۲)

شاید اس لئے سرسید نے ناول کی کہانی کو تمام مسلم خواتین کی کہانی سمجھا حالانکہ بیانیہ ایسا نہیں تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس واقعہ کو ایک افسانوی بیانیے کی صورت میں پیش کرتے ہوئے متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والی مسلم خواتین جو بلا شبہ تعلیم وتہذیب سے یکسر بے نیاز تھیں۔ سرسید کا خاندان اعلیٰ طبقہ یا اشرافیہ میں شمار کئے جاتے تھے جو یقیناً اخلاق و عادات ،سنجیدگی ومتانت میں جمہور سے بہت بلند تھے انکے مقابلے میں ڈپٹی نذیر احمد کو متوسط طبقے کے احوال کا زیادہ اندازہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے مراۃ العروس میں ایک افسانوی بیانیے کی شکل میں اس طبقے کی سماجی واخلاقی حالت کا نقشہ انتہائی اعلیٰ انداز میں کھینچا ہے۔

مراۃ العروس اور اس کے بعد کے دو ناولوں کی تصنیف کا محرک اولاً اپنے بچوں اور بچیوں کی تعلیم وتربیت تھی۔ مراۃ العروس کے چار سال بعد بنات النعش شائع ہوئی اس ناول کو مراۃ العروس کا ضمیمہ کہا جا سکتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی یہ تخلیق بھی افسانوی بیانیے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں ڈپٹی نذیر احمد نے جہاں ایک طرف تعلیم نسواں کی ضرورت پر زور دیا ہے تو دوسری طرف انکو مغربی تعلیم وطرز زندگی کے نقائص سے بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے انھوں نے اپنے ناول بنات النعش میں معاشرتی زندگی سے متعلق تمام اہم پہلوؤں کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں بیانیے کی زینت بخشی ہے اور اس میں زندگی سے متعلق سائنسی مضامین کو بڑے ہی دلکش انداز میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا انتہائی مشہور اور دلچسپ ناول گردانا جاتا ہے۔ یہ ناول مذہبی بیانیوں کے رنگ میں ڈھلنے کے باوجود اپنی ادبی خوبیوں کی بناء پر کافی عرصہ تک نصاب تعلیم کا حصہ بنا رہا۔ اس ناول کا موضوع تربیت اولاد ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں اولاد کی پرورش، تہذیب وترتیب ، اخلاق کی درستگی کے سلسلے میں والدین اور سرپرستوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ان تمام ووضاحتوں کو آپ نے اپنے ناول کا حصہ بناتے ہوئے اسے افسانوی بیانیے کی شکل دیتے ہوئے

والدین کو تربیت ونشو ونما کا ذمہ دار گردانا ہے۔ شروع سے آخر تک ناول اپنے افسانوی بیانیوں کی وجہ سے ایک مخصوص دلکشی اور تاثر کے ساتھ قاری کی دلچسپی برقرار رکھتا ہے۔

محصنات /فسانۂ مبتلا : ڈپٹی نذیر احمد کا چوتھا نصیحت آموز ناول ہے۔ جس کا سن اشاعت ۱۸۸۵ء ہے۔ اس ناول میں تعدد ازواج کی برائیوں اور خامیوں کا ذکر افسانوی انداز میں کیا ہے۔ اس مسئلے کو اپنے انداز میں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد چونکہ پائے کے عالم بھی تھے اس لئے جن حساس مسائل پر آج تک کسی نے قلم اٹھانے کی جرات نہیں کی تھی ڈپٹی نذیر احمد نے اس مسئلے کو اپنے ناول میں پروتے ہوئے اس نازک مسئلہ یعنی جس عمل کا ثبوت خود نبی کریم ﷺ اور انکے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے ملتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناول میں افسانوی بیانیے کے انداز میں عقد ثانی کی شرعی اجازت کے باوجود اس کے خلاف مدلل بحث کے ذریعے سے تعدد ازواج کی رسم کو ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں عذاب ثابت کرنے کی کوشش کی جس میں خاطر خواہ کامیاب رہے۔ اس شرعی مسئلے کے بارے میں محصنات /فسانۂ مبتلا میں مبتلا اور عارف کے بحث و حجت نے تمام پہلوؤں کو واضح کر دیا ہے۔ ناول کے بیانیہ میں مبتلاء تمام شرعی مسائل پر روشنی ڈالتا ہے جو واقعی درست معلوم ہوتے ہیں مگر عارف کے اختلاف اور اس کے صلح کل بیانات کی بناء پر اس مسئلے کی شکل بدل جاتی ہے۔ غرض یہ کہ بیانیے کی روح سے مبتلاء کا عقد ثانی اور اس کے برے نتائج سے قاری کے دل ودماغ پر تعدد ازواج سے بلا شبہ نفرت اور بیزاری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور ناول کی کامیابی کا راز ہی یہی افسانوی انداز بیان سے بحث وتکرار کے ذریعے مسئلے کا حل نکلنا ٹھہرا۔

ابن الوقت ڈپٹی نذیر احمد کا معرکۃ الآراء ناول ہے جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس ناول سے قبل تمام ناولوں میں مذہب کی لے زیادہ حاوی رہی ہے۔ اسے ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا معاشرتی ناول کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں بھی معاشرتی معاملات کے مسائل کو واضح کرنے والے کرداروں ،قصوں اور کہانیوں کو افسانوی بیانیے کے انداز میں حقیقت کا روپ دیتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ مصنف ابن الوقت کے مختلف بیانیوں میں کردار کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ معاشرے کی قدریں تیزی سے بدل رہی تھیں اور نئے و پرانے سماج میں تصادم رونما ہو چکا تھا۔ اسی کو دیکھتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد نے ناول ابن الوقت میں ابن الوقت کے اس رویے کو معاشرے کے ساتھ جوڑتے ہوئے اس کے کردار کو واضح کرنے کی غرض سے اس

کے موقع پرستانہ انداز سے پردہ چاک کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ محض انگریز کی خوشنودی مزاج کی خاطر اپنی مشرقی وضع قطع کو ترک کرنے پر تلا ہوا دکھائی دے رہا تھا کہ اس طرح وہ انگریز کی نظر میں زیادہ معزز اور محترم بن جائے گا۔مگر نوبل صاحب کے ولایت چلے جانے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ نیا تجربہ واقعی ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ چنانچہ بعض افسر جو اسکی اس حرکت سے نالاں بھی تھے وہ نوبل صاحب کے عدم موجودگی میں ابن الوقت سے مزید ناراض اور خفا رہنے لگے۔ابن الوقت مالی اعتبار سے اسودہ حال تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں بیانیوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ اردو ادبی طبقہ کے جن لوگوں کو ناول کے ساتھ لگاؤ ہے وہ ہرگز انہیں بابائی بیانیہ کہنے سے نہیں کترائیں گے۔کیونکہ افسانوی بیانیوں کا جب، جہاں اور جس قدر بھی ذکر آئے گا تو ان کا نام سرفہرست ہو گا۔ کیونکہ اردو ادب میں خاص کر ناولوں کے حوالے سے بیانیوں کا آغاز انہی کے ناولوں سے ہوا۔ان کے ہاں جہاں ناولوں میں کہانی کے کرداروں پر توجہ دی جاتی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ بیانیے کے افسانوی انداز کو اپناتے ہوئے اکثر کردار ہمیں اپنے زندگی میں بالکل حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔یعنی نذیر احمد کے ناولوں میں انکا کھرا اور سچا پن نکھر کر ان ناولوں کے بیانیوں میں مزید سچ کے پہلو بکھیرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے قاری ان کے ناول بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔

نذیر احمد کے اکثر و بیشتر ناولوں میں افسانوی انداز بیان خاصی دلچسپی کا باعث رہا ہے۔ جب ایک قاری ان کے ناول کا مطالعہ کرنے لگتا ہے تو ان کو ناول کے مختلف بیانیوں میں خاصی دلچسپی ہونے لگتی ہے کیونکہ بیانیوں میں تسلسل اور جڑا پن قاری کے لیے مذید تجسس کا باعث دکھائی دیتا ہے۔ہر وہ شخص جسے ناول پڑھنے کا شوق ہو اسکی کوشش ہوتی ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کا مطالعہ وہ ضرور اپنی زندگی میں کرے۔یہی وجہ ہے کہ دیگر ناول نگاروں کے مقابلے میں نذیر احمد کا اپنا ہی ایک منفرد مقام ہے جس کی بناء پر ان کے ناول آج بھی اپنی شہرت کے لحاظ سے مقبول عام کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت:

عبدالحلیم شرر ایک اعلیٰ تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر ایک زود نویس مصنف تھے انکے اکثر ناولوں کے بیانیے جوکہ تاریخی نوعیت کے ہیں ان میں اسلام کے شاندار ماضی کا

ذکر ملتا ہے جن میں مسلم قوم کے حوصلے،شجاعت، فراخدلی، مذہبی جوش اور ان کے روحانی ارتقاع کی تعریف وتوصیف ان بیانیوں کے ذریعے افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اسی لیے ان کے ناولوں کی کہانیاں تاریخی افسانوی بیانیوں کا مرقع معلوم ہوتی ہیں۔

ان کے تاریخی ناولوں کا ہر ہر بیانیہ حمیت اسلامی کو جوش میں لاتا ہے۔ ان ناولوں کے افسانوی بیانیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان قراء حضرات کے دلوں میں خون جوش مارنے لگتا ہے اور ترقی کرنے پر تلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔شرر کے ان تاریخی ناولوں کے بیانیوں سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے بجھے ہوئے جوش اور پژمردہ حوصلے کو از سرنو زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔شرر کے ہاں اکثر تاریخی ناول ہیں جن میں موجود تاریخی کرداروں کو بیانیوں کی صورت میں سمیٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان تاریخی بیانیوں کی وجہ سے مسلمان طبقے نے انہیں بڑے شوق سے پڑھا۔ یہ تاریخی ناول جو کہ مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں ان کے بیانیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اور کہانی کو سمجھنے کے بعد یہی تاثر حاوی دکھائی دیتا ہے کہ یہ بیانیے مسلمانوں کے دلوں پر جو افسردگی طاری ہے(غدر) کی وجہ سے وہ دور ہو۔اس کے مقابلے میں تازہ جوش اور ولولہ پیدا ہو اور وہ بے دست و پا ہو کر بیٹھ جانے کے بجائے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں اور اپنے لیے ایک قومی مقصد کا حصول یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ انہیں اتنا دلچسپ بنانا بھی ضروری خیال کیا گیا کہ وہ عوام کو پسند آئے۔ان بیانیوں کو پڑھنے کے بعد قاری کسے بھی طرح دماغ پر بوجھ محسوس نہیں کرتے۔ ان تاریخی بیانیوں میں دلچسپی اور تفریح کا یہ پہلو حسن وعشق کے ذکر کے بغیر پیدا ہونا ناممکن نہیں۔ ان تاریخی بیانیوں میں اس طرح کی ترمیم وتحریف جائز سمجھی گئی جو دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ناولوں کے تاریخی یا نیم تاریخی بیانیوں کے علاوہ حسن وعشق سے متعلق بیانیوں کا اسلوب ایسا ہے جو پڑھنے والے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور جب قاری ان افسانوی حسن وعشق کے بیانیوں کو پڑھتا ہے تو ان بیانیوں کی وجہ سے وہ بھرپور تسکین حاصل کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ شرر کے تاریخی اور حسن وعشق کے موضوعات سے متعلق جتنے بھی ناول اردو ادب میں قاری کے لیے میسر ہیں ان تمام ناولوں کے بیانیوں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ان تمام ناولوں کی کہانیوں کا مقصد صرف اور صرف پبلک کے نئے جذبے، جوش اور ولولہ کو پروان چڑھانا ہے۔ شرر کے ان ناولوں میں خواہ انکا موضوع کچھ بھی ہو بہرحال ان کے ہاں ناولوں کے بیانیے اپنے مقصد میں صاف اور

واضح دکھائی دیتے ہیں اور ایک قاری کے لیے ان کے ناولوں کی کہانیوں میں سبق اور مستقبل کے لیے بہت سی چیزیں پوشیدہ ہوتی ہیں جن کے مطالعے سے ایک قاری کی زندگی مثبت سمت میں پروان چڑھ سکتی ہے۔شرر کے ناولوں کے بیانیوں کا اسلوب دیگر ناول نگاروں کے مقابلے میں قدر مشکل ضرور ہے مگر دلچسپ اور پُر اثر بھی ہے۔اس لیے قاری کی دلی تسکین کا مکمل سامان شرر کے ناولوں میں ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہوسکتی۔جہاں رتن ناتھ سرشار کا شمار مخصوص مسلم فکشن سے ماوراادیبوں میں ہوتا ہے۔ان کے ناولوں میں خاص کر فسانہ آزاد ، کامنی، کندن،جام سرشار کے اکثر و بیشتر بیانیے سوانٹے جیسے غیر مسلسل انداز مذاح اور زندگی کے رنگا رنگ مظاہر کی مدد سے اپنے وقت کے اودھ کی تخلیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ان کی تحریروں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رتن ایک زندہ دل اور یادگار کرداروں کی تخلیق کرتے ہیں۔خاص طور پر ان کے ناولوں کے کرداروں سے جو کہ افسانوی بیانیوں کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح رتن اپنے اردگرد بے تکلفی کا ہالہ لیے ہوئے نتائج سے بے پروائی سے نئی مہم پر گامزن ہونے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت:

اردو ناول و افسانہ کی ملکہ قرۃ العین حیدر ایک ایسی عبقری لکھاری تھیں کہ جب بھی ذکر افسانے یا ناول کا ہوگا تو ان کو پڑھنے والے انہیں یاد کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔باپ افسانہ نگار،ماں کہانی نویس تو بیٹی بھلا کیسے پیچھے رہ سکتی تھیں ۔وہ بیس بائیس سال کی عمر میں اپنی تخلیقی تحریروں میں دنیا کی رنگینیوں اس کی سچائیوں،مشعلوں اور سوز و ساز کو دریافت کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ ذرہ فاصلہ رکھ کر معروضی انداز سے اس زندگی کو دیکھیں اور دکھائیں لیکن جذباتی رشتے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ اس رویے کا اندازہ انکے شروع کے ناولوں کے بیانیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب قرۃ العین حیدر متحدہ ہندوستان میں تھیں ۔ایسی صورت میں قراۃ العین حیدر کی تحریروں میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کرداروں کا غلبہ ہونا قدرتی عمل تھا۔مگر تقسیم وطن اور فسادات کے بعد جب اودھ کی شام پر اندھیرے چھا جاتے ہیں تو قرۃ العین حیدر انسانی حیات اور اجتماعی حقیقتوں کے تئیں ایک سنجیدہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔اب وہ زندگی کو تاریخ کے وسیع تناظر میں دیکھنے لگتی ہے۔ اس رویہ میں تبدیلی کو باآسانی پاکستان میں لکھے گئے ان کے ناولوں اور افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔جنکا سادہ بیانیہ اسلوب اور

پر تاثیر کہانیوں میں ڈوبے ہوئے کردار جو کہ خود ہی گواہی دے رہے ہیں اور جن کا موضوع پاکستان میں جاگیرداروں اور نو دولتیوں کے ہاتھوں پنپنے والے ایک نئے استحصالی معاشرے کے تضادات ہیں۔ اسی طرح انکے ناولوں میں ماضی و حال دونوں کا تجربہ ایک ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں خاص طور پر انکے ایک ناول کا اجمالی سا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جن سے میری مراد گردش رنگ چمن کے المناک بیانیوں کو عہد حاضر کے پیچیدہ حقائق سے جوڑا گیا ہے۔ مصنفہ کی کوشش ہے کہ اسکے اپنے فکری آہنگ سے ان مختلف النوع واقعات کی کڑیاں جڑ سکیں۔ اسی لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس عظیم کارنامہ میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ کیونکہ ادیب دانشور اور لکھاری کسی بھی قسم کی چار دیواری سے آزاد ہوتا ہے، اس کی سوچ کا تعلق ہر طرح کے حدود و قیود سے ماورا ہوتا ہے، وہ سیاسی، نسلی، علاقائی، لسانی اور تعصب کی پابندیوں اور گروہ بندیوں میں جکڑا ہوا نہیں ہوتا اس کی سوچ، خیالات و فکر ان تمام چیزوں سے جدا ہوتی ہے۔ لہذا لکھاری خواہ کسی زبان کا ہو، کسی ملک سے اس کا تعلق ہو وہ صرف اور صرف لکھاری ہی ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ سوچتا ہے، سمجھتا ہے، محسوس کرتا ہے، خاص طور پر اپنے اردگرد کے ماحول سے، اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر اب برقی میڈیا پر دکھائے جانے والے گفت وشنید کے مکالموں سے جو کچھ وہ اخذ کرتا ہے اپنی تحریروں میں اپنی سوچ شامل کرکے اس کا اظہار کردیتا ہے۔ چنانچہ قرۃ العین حیدر جو عینی آپا کے نام سے بھی معروف تھیں کی تحریروں کو اسی تناظر میں لینا چاہئیے۔ ادیب خواہ پاکستان کا ہو، ہندوستان کا ہو یا کسی اور ملک سے اس کا تعلق ہو وہ ادیب اور لکھاری ہے ہوتا ہے اس کی سوچ تخلیق کے سوا کچھ اور نہیں ہوتی۔ عینی آپا ادیبوں، دانشوروں اور لکھاریوں کے لیے صرف ادیب تھیں، لکھاری تھیں، افسانہ نگار تھیں، ناول نگار تھیں اور کہانی نویس بھی۔ انہوں نے اردو ادب کو ایک نیا اسلوب اور اچھوتی شناخت دی۔ ان کی تصانیف میں میرے بھی صنم خانے، صفینہ غم، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار، چائے کے باغ، آگ کا دریا، پکچر گیلری، چاندنی بیگم، آخر شب کے ہمسفر، کے علاوہ دلبر، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو، سیتا ہرن وغیرہ اپنے اعلی بیانیوں اور انمٹ کرداروں کی بدولت بلندی کو چھوتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے قدم بڑھاتے ہوئے انہوں نے تو افسانہ، ناول اور کہانی کے حوالے سے اس قدر مواد تخلیق کیا ہے کہ ہمارا مورخ برسوں ان کو اپنا موضوع بناتا رہے گا، محقق ان کے تخلیق کردہ مواد پر تحقیق کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ لکھاری ان کی شخصیت اور کارناموں پر قلم چلاتے رہیں

گے۔ان پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، رسالوں نے خاص نمبر شائع کیے ہیں۔قراۃ العین حیدر صرف افسانہ نویس، ناول نگار اور کہانی نویس ہی نہ تھیں بلکہ وہ ایک استاد بھی تھیں، صحافی بھی، انہیں موسیقی، آرٹ، تاریخ اور آرکیالوجی سے بھی لگاؤ تھا۔یہی نہیں بلکہ ناول نگار اور افسانہ نگار تو اپنے ماحول اور اردگرد کے موحول کا مطالعہ باریک بینی سے کرتا ہے وہیں سے وہ مختلف کرداروں سے واقف ہوتا ہے۔جن کو اپنے ناولوں کے بیانیوں میں انتہائی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے۔قراۃ العین حیدر نے بھی یہی کیا ہے۔ان کے کردار آسمانوں میں نہیں رہتے بلکہ یہیں ہمارے آپ کے درمیان گھومتے پھرتے اور اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہم انہیں نظر انداز کردیتے ہیں جب قراۃ العین حیدر نے انہیں اپنے ناولوں میں افسانوی انداز میں بنا سنوار کر پیش کردیا ہے۔قراۃ العین حیدر کو اس دنیا سے جدا ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں لیکن ان کی یاد پڑھنے والوں کے دلوں میں آج بھی روشن اور تابندہ ہے اور یہ یاد ہمیشہ قائم و دائم رہے گی۔

اردو کی یہ مایہ ناز ادیبہ جنھوں نے افسانوں ،ناولوں اور کہانیوں کے بیانیوں کا ایسا بے بہا خزانہ،لفظوں کی کہکشاں، حسین جملوں کی بے مثال قمر پیکر چھوڑی ہے کہ جس کی مثال اردو ناول و افسانہ کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔قرۃ العین حیدر معروف اردو کے پہلے افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کی صاحبزادی ہیں۔ناول میں آگ کا دریااور آخر شب کے ہمسفر کا مقابل کا ناول سامنے نہ آسکا۔یہ دونوں ناول اردو ادب میں اپنی کہانیوں اور بیانیوں کے اعتبار سے شاہکار تخلیق گردانے جاتے ہیں۔اس پر انہیں بھارتی حکومت کی جانب سے اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

عزیز احمد کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت:

عزیز احمد کے اردو ادب کے حوالے سے ان کے تاریخی ناولوں میں بیانیوں کا اسلوب دیگر تاریخی ناول نگاروں کے مقابلے میں چنداں مختلف ہے ۔ انکے ادبی ذوق کے مطابق اکثر ناولوں اور افسانوں میں مختلف تاریخی وتہذیبی تصورات حاوی دکھائی دیتے ہیں۔انکے تاریخی ناولوں میں بیانیوں کے موضوعات اپنے تاریخی واقعات کے لحاظ سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔یہی تاریخی موضوعات ناول نگاری کے فن میں عزیز احمد کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔مثلا ان ناولوں میں مختلف کہانیوں اور قصوں کو افسانوی بیانیوں کے انداز میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ان میں انکا ناول ہوس ،مرمر اور خون، گریز ،

آگ وغیرہ کا شمار ان تاریخی ناولوں میں کیا جاتا ہے کہ جن کی اکثر کہانیاں اور واقعات تاریخی نوعیت کے ہیں اور ساتھ ہی ان ناولوں کی کہانیوں کے واقعات کو مختلف افسانوی بیانیوں کے انداز میں قاری تک پہنچانے اور انکی ذہنی تسکین کو مدنظر رکھتے ہوئے دلچسپ انداز اسلوب اختیار کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔

ہـــوس اگر چہ عزیز احمد خود ہی رد کر چکے ہیں لیکن اس ناول کے بیانیوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پروفیسر عزیز احمد کے تصور تاریخ و تہذیب نے کس کس انداز میں اور کہاں کہاں اپنے لئے جگہ بنانے کی کوشش کی ہے۔حالانکہ ان کے اپنے الفاظ جسے ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ اپنی کتاب ''عزیز احمد:ادب، تاریخ اور تہذیب (ہند اسلامی کلچر کے عہد زوال کی چند جہات میں کوڈ کرتی ہیں) کہ:

> 'چوہدری صاحب (ناشر) باوجود میرے اصرار اور خوشامد کے ہـــوس کو تیسری مرتبہ اور مـرمر اور خون کو دوسری مرتبہ چھپانے پر تلے ہوئے تھے ان دونوں ناولوں کو اپنا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ دونوں طالب علمی کے زمانے کی چیزیں ہیں اس میں انکسار کو دخل نہیں''۔(۱۳)

عزیز احمد کے ہوس کے متعلق بیان کے باوجود عزیز احمد نے ان ناولوں کو اپنے زمانہ طالب علمی کی یادگار قرار دیا۔ہوس اپنے تمام خرابیوں کے باوجود ایسا کم مواد رکھتا ہے جو اس دور کے تخریبی عناصر کی تخریب وتعمیر کے کام کو آگے بڑھا رہا ہو۔ اس کا افسانوی بیانیہ جس میں پردے کی جکڑ بندی ،شریف بیبیوں کی ذہنی اور جسمانی گھٹن اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج اس دور کے تہذیبی تناظر کو اُجاگر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ہـــــوس کا بیانیہ جو کہ پوری معاشرتی تہذیب کو بیان کرتا ہے اور جس میں عزیز احمد اپنے اس استدلال پر زور دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ''ایک شخص گناہ کرتا ہے اور ہزاروں اسکا خمیازہ بھگتتے ہیں مگر ان سب کا باعث کیا تھا، معاشرت کی خامیاں ،اسی طرح تعلیم تو دی جانے لگی مگر آزادی کا پتہ تک نہیں۔ لڑکیوں کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے گئے اور ان کو گناہ کہنا بھی انکے ہاں ظلم ٹھہرا۔عزیز احمد مزید کہتے ہیں کہ فرض کیا وہ بے پردہ لڑکیاں ہوں تو حالات اتنے ہرگز خرابی کی طرف نہ جاتے اور کوشش اس قدر کی

جاتی کہ گناہ سے بچا جائے اور پھر بھی نتیجہ نکلتا ہے گناہ۔عزیز احمد کے اس بیانیہ سے مکمل اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پردہ کو اگر گناہ اور گھٹن مان بھی لیا جائے مگر پھر بھی یہ پورا سچ نہیں کہلا سکتا۔ اگر ان کے ہاں اس بیانیے کو مان بھی لیا جائے تو پھر بھی اس پر کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ یعنی پردہ ہی سارے تہذیبی مسئلے کا حل ہے، شادی بیاہ کی رسومات ،تعلیم مردوں اور عورتوں کا مختلف تقریبات میں میل جول اور ایسے کئی سوالات اس عہد کے بھرپور عکاس ہیں۔'ہوس' کے بیانیے میں ایک کردار'جمیل ۔۔۔جو زلیخا اور سلیمہ کا بھائی ہے۔۔۔اپنے بہنوں کے سلسلے میں جس آزاد روی کا مظاہرہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔وہ کئی اعتبار سے ناقابل یقین ہے دراصل اس کے پردے میں بھی عزیز احمد بول رہے ہیں۔میری ہوس کے بارے میں جو بھی رائے ہو اس سے اتفاق کے باوجود ناول میں موجود اس تہذیبی اور کسی حد تک تاریخی تناظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو اس ناول کے ماحول اور کرداروں سے نکل کر سامنے آتا ہے۔

مرمراور خون ناول کو بھی عزیز احمد نے تنقید سے مستثنی نہیں سمجھا۔اس ناول کے بیانیے بھی ان کے مختلف کرداروں کو گناہ کی مختلف کشمکشوں سے گزارتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں عزرا کا کردار زلیخا کے کردار سے مختلف نہیں۔ اس ناول کا بیانیہ کرداروں کے جنسی تعلق کا خبر دیتے ہیں۔ جہاں ہوس میں دو نسوانی کردار گناہ کا اشارہ دیتے ہیں وہاں ''مرمراور خون'' میں دو مرد کردار طلعت اور رفعت عزرا کے گرد گھومتے ہیں۔

عزیز احمد نے مرمر اور خون میں رفعت اور عزرا کے ساتھ ساتھ طلعت اور زینب کی نفسانی واردات کو کھل کر مزے لے لے کر بیانیہ کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔اس ناول کے بیانیے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ ناول ناپختہ ذہن کے ایک نوجوان کی لذت پسندی کا نتیجہ ہے۔

ناول ایک قسم کے طبقاتی تقسیم کو بیان کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔عزرا اور زینب کا گناہ اگر چہ اسے گناہ تسلیم کرلیا جائے ایک جیسا ہے۔ دونوں مردوں کی وحشیانہ جبلی ہوس کا شکار ہو چکی ہیں جس میں فرق صرف اتنا کہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔اور ایک اسی کی ملازمہ۔ اسی طرح بیانیہ کی روح سے طبقاتی لحاظ سے زینب زیادہ آسان شکار تھی جس کے ردعمل میں سپردگی کی بجائے ردعمل دیکھنے میں ملتا ہے جبکہ عزرا جزباتی پہلو سے اتنا ہی آسان شکار ثابت ہوئی۔ناول کا بیانیہ تہذیبی روح سے طبقاتی رویوں کے

فرق کو واضح کرتا ہے جس کی روح سے طبقہ شرفاء کی خواتین تہذیبی طور پر زخم خوردہ جبکہ زینب جیسی محنت کش عورتیں ایک طوفان سے نکل کر دوسرے طوفان میں پھنس جاتی ہیں۔محنت کش کے ہاں اس صدمے کو آسانی سے برداشت کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کے برعکس عزرا ایک سپردگی سے دوسری سپردگی کی طرف سمجھوتے کی راہ اختیار کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

گریز عزیز احمد کا ایک شاہکار ناول گنا جاتا ہے جو ایک عہد کی تاریخ دہراتا ہے جس میں ہندوستانی تہذیب اور مغربی تہذیب اپنی اپنی سطحوں پر شکست و ریخت کا شکار ہورہی ہیں۔ناول کا بیانیہ دوسری جنگ عظیم اس کے بعد کے نتائج اور اثرات پر مبنی عبارت ہے۔گریز کا اصل بیانیہ دراصل دو تہذیبوں کے تاریخی و سماجی رویوں کو بیان کرتا ہے۔گریز میں دو کرداروں 'نعیم' اور 'بلقیس' جو کہ ناول کے بیانیے کی جان مانے جاتے ہیں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔دراصل یہ دو کردار مغرب اور مشرق دونوں کے حالات، رویوں، رسوم و رواجات، عادات، ثقافت اور کئی دوسرے تہذیبی اور اخلاقی عوامل کو واضح کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔لیکن اس سے ہٹ کر بھی مصنف نعیم کی کچھ جنسی اور نسوانی خواہشات کا ذکر اپنے ناول گریز میں کچھ ان الفاظ میں کرتا ہے:

> مگر تم کو ایلس سے محبت تھی۔میں تو سمجھی تھی کہ ایک سے زیادہ مرتبہ سچی محبت ممکن نہیں۔
>
> نعیم نے مسکرا کے کہا یہ میری پیاری لڑکی یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ مجھے سچی محبت کسی کے ساتھ ہوئی بھی یا نہیں۔شاید مجھ میں سچی محبت کی صلاحیت ہی نہیں۔مگر اب تک اپنی زندگی میں تین لڑکیاں مجھے ایسی ملیں جن کی وجہ سے میں کئی راتوں نہیں سویا۔کئی دن پریشان رہا اور سمجھتا رہا کہ ان کا حاصل کر لینا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے''۔(۱۴)

مصنف نے اس مختصر سے بیانیے میں نعیم کے کردار کے ذریعے مشرقی اور مغربی دنیاؤں کے اخلاقیات کے درمیان فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک مشرقی شخص جب مغرب میں جا کر سکونت اختیار کرتا ہے تو اس کی زندگی میں کس کس قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ان تبدیلیوں میں مشرق کے مقابلے میں مغرب

کا اخلاقی ماحول کہ جس کا ذکر گریز کے اس بیانیہ میں کیا گیا ہے۔نعیم کے اس افسانوی کردار سے مصنف یہ بھی دکھانے کی بھر پور کوشش کرتا ہے کہ مغربی معاشرے کا ماحول انسان کو کس طرح یکدم تبدیل کر دیتا ہے۔اس سے انسان کا صرف ماحول ہی نہیں بلکہ سوچ میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ جیسے نعیم کا مشرقی عورت بلقیس سے دلی لگاؤ مشرقی انداز میں ہونا لیکن مغربی معاشرے میں جانے کے بعد وہ وہاں ایک عورت تک تو کیا ایک ایک وقت میں کئی عورتوں کے ساتھ تعلقات کو پروان چڑھانے میں مہارت حاصل کرتا ہے۔حالانکہ اس قسم کے ماحول مشرقی معاشرہ میں نا ہونے کے برابر ہے۔اسی طرح عزیز احمد اسی ناول کے ایک اور مقام پر ذکر کرتا ہے کہ:

> ہندوستان میں میرا کوئی قریبی عزیز نہیں یعنی ماں،باپ،بھائی بہن زندہ نہیں ہیں۔تمہارے لئے اپنا وطن چھوڑ سکتا ہوں۔ہندوستان میں میرا کوئی دوست نہیں۔جب سے تم مجھے مل گئیں،مجھے محسوس ہوا کہ اب میں اکیلا نہیں رہا۔اب کوئی اور بھی ہے جو میرا ساتھ دے گا''۔(۱۵)

نعیم کا مشرقی دنیا سے مغربی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد وہاں کے ماحول کا اتنا اثر لے لینا کہ اب وہ مغربی عورتوں کی خاطر اپنے جنت نظیر ملک کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ یہاں آکر خواہش نفس پر قابو پانا اب اس کے لئے مشکل سے مشکل کام بنتا جا رہا تھا۔ ایک کی بجائے کئی کئی خواتین کی خواہش کا ہونا معمولی سی بات بن گئی۔ اسی نفسانی خواہش کی بنا پر ہی تو نعیم نے اپنے والدین،بہن بھائی اور تمام رشتوں کو چھوڑنے کا تہیہ کر لیا۔ یہ سب مغربی معاشرے کی کارستانی ہے کہ جس نے آج مشرقی دنیا میں حل چل مچا رکھی ہے اور ہر کوئی مغرب کا دلدادہ دکھائی دیتا ہے۔ گریز کا بیانیہ جس میں نعیم ہندوستان یعنی مشرقی رسوم و رواجات کا علمبردار ہے مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا مشرقی طرز زندگی کے علمبردار میں اکثر و بیشتر گھرانوں کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح مشرقی افراد مغرب جا کر وہاں کے تہذیب و تمدن کو اپنالیں۔اسی کی مثال نعیم کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مغرب کا رخ کرنا ہے اور مغربی رسوم و رواجات کو پسند کرنا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مشرقی انداز کو بھی قائم رکھنا چاہتا ہے گریز کے بیانیہ میں بھی نعیم مشرقی فرد کی حیثیت سے تو زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن مغربی تہذیب اور گوروں کی عادات کو بھی اپنے اوپر لازم قرار دینے کی کوشش کرتا ہے بلقیس مشرقی رنگ میں رنگنا پسند کرتی ہے اور اپنی اسی حیثیت کو برقرار

رکھنا چاہتی ہے جبکہ نعیم ایک وقت میں دونوں تہذیبوں کو اپنانے کی خواہش رکھتا ہے یعنی وہ بلقیس کو مغربی گوری خاتون کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔

نعیم بے وقوف بلقیس کے ساتھ ساتھ گوری عورتوں کی زلف کا بھی اسیر دکھائی دیتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ ان سے مشرقی عصمت کا متقاضی بھی ہے۔ یہ تہذیبی کشمکش باقاعدہ ایک افسانوی دستاویز بن جاتی ہے اور اس دستاویز کی پرتیں جب کھلتی ہیں تو اس کے واقعات قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔اور دوسری طرف تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک گلدستہ کی شکل میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ناول کے اس قسم کے بیانیہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عزیز احمد کی ناول کے کرداروں پر کتنی گرفت ہے۔

آگ عزیز احمد کا ایک اوراہم ناول ہے جس کے واقعات کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ بیانیہ کا سہارا لیتے ہوئے قاری کی دلچسپی بڑھانے کی بہترین کوشش کہی جا سکتی ہے۔ ناول تاریخی ہونے کے حوالے سے تہذیبی عناصر کو اجاگر کرنے میں وہ بے حد کامیاب رہے ہیں۔ ناول 'آگ' کا بیانیہ طبقاتی،سماجی اور صنفی تضادات کی کئی پرتیں کھول کر سامنے لاتا ہے۔

ناول آگ کا بیانیہ وادی کشمیر کا پس منظر پیش کرتا ہے جس میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور مہاجنی نظام کی برائیوں پر کڑی تنقید کی گئی ہے اگے بڑھ کر ناول کی کہانی کا بیانیہ محنت کشوں کے استحصال اور افلاس کے خلاف اس ناول میں آواز بلندکرنے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔مزید یہ کہ ناول میں کشمیر کی عورت کی مظلومیت کا عکس ماہرانہ فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ایسی بلندی ایسی پستی عزیز احمد کا اجتماعی نوعیت کا ناول گردانہ جاتا ہے جس کا بیانیہ قوموں کے عروج و زوال کی داستانوں کے رنگ میں رنگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بقول حسن عسکری:

''یہ اردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے''۔(۱۶)

اسی طرح بیگم افضل کاظمی کے بقول:

ایسی بلندی ایسی پستی کو اگر ان کی عظمت کا نشان قرار دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا''۔(۱۷)

ان آراء کی روشنی میں یہ ناول نہ صرف تہذیبی اور تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے بلکہ یہ کرداروں کی ٹوٹ پھوٹ کے عمل کا ناول بھی ہے۔ جس کا بیانیہ خاصہ وسیع نوعیت کا ہے جو دوسری عالمی جنگ ،اجتماعی سرمایہ دارانہ نظام کا جبر اور طبقاتی نظام کی تہذیب سے ہے۔ جس نے اپنے ظاہری طور طریقے ہی نہیں بلکہ اپنے وجود تک کو تبدیل کر لیا ہے اور انگریزی تہذیب کے رنگ ڈھنگ میں رچ بس گئے ہیں۔اس ناول کے بیانیہ میں عزیز احمد نے نئے سیاسی حوالوں کو شامل کرتے ہوئے ایک ایسا منظر نامہ تخلیق کیا ہے جس نے اس زوال پزیر جاگیردارانہ معاشرے کی تصویر کو ہمیشہ کے لئے ناول میں محفوظ کر لیا۔ یہ معاشرہ جو اپنے تاریخی تناظر میں آخری عہد میں مغلوں کے زوال کا تسلسل تھا اور جس نے تاج برطانیہ کے ساتھ وفاداری میں اپنی عافیت محسوس کی تھی، اس کا اس سے بہتر مرقع پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید اسی لئے ناول کو عالمی سطح پر بھی پزیرائی ملی اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔

ان ناولوں کے علامہ عزیز احمد کے اور بھی چھوٹے بڑے ناول ہیں مگر ان کی حیثیت یا پھر یہ کہ سکتے ہیں کہ ان کی کہانیاں یا قصے بیانیہ نوعیت کے نہیں ہیں کہیں تو مکالموں سے کام لیا گیا ہے اور کسی جگہ تخیلانا انداز اپناتے ہوئے قصہ گوئی سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے ۔اس قسم کے ناولوں کو افسانوی بیانیوں والے ناولوں کی فہرست میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

انتظار حسین کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت:

انتظار حسین کا مزاج خالصتا مشرقی رہا ہے بلکہ انکی فکر اور انکی کہانیوں کے مواد کے ساتھ ساتھ انکی تکنیک بھی بنیادی طور پر دیسی ہے۔لیکن نہ انکا مطالعہ محدود ہے نہ تخیل جس حد تک مغربی افکار و اسالیب دیسی فضا میں شامل ہو گئے ہیں۔اسی حد تک وہ ان کے فن ناول نگاری کا حصہ بھی ہیں۔روسی اور انگریزی مطالعے سے متاثر دکھائی دینے والے انتظار حسین ''ٹی ایس ایلیٹ'' کا اثر بھی انکے ایک دو ناولوں اور کئی افسانوں میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔خصوصا انسانیت کے زوال اور قرب قیامت کی تباہیوں کا ذکر وہ ایلیٹ ہی کے انداز میں کرتے ہیں۔انہیں ایسی مثالیں اپنے معاشرہ میں با آسانی مل جاتی ہیں۔

انتظار حسین کی سب سے بڑی خوبی انکا ناول کی کہانی بننے کا فن ہے۔ان کے ہاں اگر چہ ناولوں کی کہانیوں میں بیانیہ انداز اسلوب بہت کم ہے مگر ان کی نسبت اپنا مقصد بیان کرنے کے لئے مکالموں

سے کام لیتے ہیں۔ناول نگاری میں انکا بیانیہ دیگر ناول نگاروں کے بیانیہ انداز سے قدرے مختلف ہے۔انکے وہ ناول کہ جن میں بیانیہ قدرے زیادہ مستحکم اور پر اثر دیکھا جاتا ہے ان ناولوں کو ذیل میں مختصرا ذکر کیا جاتا ہے۔

بستی انتظار حسین کا پہلا اہم ناول ہے جس کا بیانیہ ہجرت سے ماخوذ ہے۔جو مصنف نے آزادی کے بعد اختیار کی اس ناول کا مرکزی کردار خـــاك ہے اس ناول کے بیانیہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنف اپنے احساسات سرحد کے اس پار چھوڑ آئے ہیں اور اب ان کا وجود آزاد ملک پاکستان کی سرزمین پر سانس لے رہا ہے۔اس ناول کا بیانیہ جسے ہم بجا طور پر تارکین وطن کا نوحہ بھی کہ سکتے ہیں اس ناول میں متعدد سماجی مسئلوں کے سر اٹھانے کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔جس میں نئی اور پرانی نسلوں، ماضی حال کے زمانوں اور جدید و قدیم فکر و عمل کے حامل کرداروں کا نظارہ بھی کرایا گیا ہے۔

ڈاکٹر انور پاشا بستی کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

> ''ذاکر کے ابا دراصل،ان مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جنہیں پاکستان میں مہاجر کہا جاسکتا ہے۔مہاجر اپنے مشترکہ تہذیبی ورثہ کو فراموش نہ کر سکے۔لہذا ملک میں خود کو اجنبی ہی تصور کرتے ہیں''۔(۱۸)

اکثر بھارتی دانشوروں کا یہی موقف ہے کہ مہاجرین کا دل: برصغیر کی مشترکہ تہذیب کی بنیاد پر۔ بھارت ہی میں اٹکا ہوا ہے جبکہ پاکستان میں وہ اجنبی کی مانند الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں حالانکہ ہرگز ایسا نہیں ہے اور نہ ہے بستی انکے اس موقف کی تائید کرتی ہے ۔

پاکستان میں مہاجرین اور مقامی افراد میں کوئی تضاد نہیں اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی تنازعہ ہے۔دراصل ترقی اور آزادی مصنف کو از حد عزیز ہیں۔ناول میں ورایت کا ذکر وہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ وہ اسکا پوسٹ مارٹم کرسکیں۔

تـذکـرہ انتظار حسین کا ایک معمولی سمجھا جانے والا ناول ہے۔جسے بستی جیسی پزیرائی تو نہ مل سکی مگر وزیر آغا اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> تـذکـرہ بستـی کی توسیع ہے کہ اس میں ماضی و حال کو نسبتا کشادہ کینوس

پرایک دوسرے کے روبرو لاکھڑا کردیا ہے،مگر بستی کی نسبت ،اس میں ابعاد زیادہ
ہیں۔۔۔چنانچہ انتظار حسین کا یہ ناول یقیناً اس قابل ہے کہ اسے اردو کے چند
چوٹی کے ناولوں میں شمار کیا جائے''۔(۱۹)

تذکرہ کا بیانیہ جس کا آغاز ہندو مسلم مثالی اتحاد اور تحریک خلافت کے موضوع پر مبنی ہے۔جس کا بیانیہ افسانوی طرز اسلوب کا حامل ہے مگر واقعہ کو کھولنے کے لئے یہاں مکالموں سے کام لیتے ہوئے اپنی نثر کو کہیں رکنے نہیں دیا۔اس کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی اسکی ایک واضح سوچ اور مخصوص جہت کارفرما ہے۔

چاند گہن کا آغاز بڑی بوڑھیوں کے توہمات سے شروع ہوتا ہے۔ناول کا بیانیہ افسانوی انداز میں ناول کے موضوع پاکستان کی آزادی کے بعد نئے وطن میں بسنے والے مہاجرین کا فکر وعمل ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انتظار حسین مزید بتانا چاہتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا قدامت پسند معاشرہ پہلی عالمی جنگ تک زندہ تھا۔یہ زندگی روایت اور جمود کے ملبے تلے دب گئی تھی۔مشرق کا روایت پسند انسان عقیدے اور وہم کی رنگدار عینک لگا کر زمین اور آسمان کو دیکھتا تھا اور ہر نئی بات سے اسے ڈر لگتا تھا۔آخر اس کی کیا وجہ تھی۔

مصنف ناول کے ذریعے قاری کو بتانا چاہتا ہے کہ وقت بہت آگے نکل چکا ہے لکیر کے فقیر صفر ہو گئے ہیں۔فرد اور قوم واضح آزادی کے بغیر مستقبل کی تعمیر نہیں کر سکتے۔ماضی کی روایات کے سہارے آزاد دنیا میں باوقار مقام حاصل کرنا ناممکن ہو چکا ہے۔لہذا لمبی تان کر خواب دیکھنے سے آزادی کا سفر درست سمت میں ممکن نہیں۔

آگے سمندر ہے ناول کا عنوان ہی معنی خیز اور فکر انگیز ہے۔سمندر کے آگے ہونے کا شعور انسان کو غیر متحرک اور جامد نہیں رہنے دیتا۔اسکی نت نئی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار لاتا ہے۔تاہم جمود اور روایت پرستی کو خیر باد نہ کہا جائے تو آپ آگے ہوتے ہیں اور سمندر آپ کے تعاقب میں۔

آغاز کو دیکھتے ہوئے ناول کا بیانیہ ماضی قریب کو فراموش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کی زندگی اس ناول کا خاص موضوع ہے۔بظاہر ناول کا مرکز توجہ کراچی شہر ہے۔جو بیانیہ کے حوالے سے اولاً جھگیوں کا شہر ہے۔بیانیہ میں مصنف بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ مہاجرین پیچھے رہ

جانے والے بھارتی عزیزوں کو فراموش نہیں کرتے۔ جہاں مصنف نے اس ناول کے بیانیوں میں پاکستان کا ذکر کیا ہے تو وہاں ساتھ ہی ساتھ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی حالت زار کو بھی بیان کیا ہے۔مصنف کا ایک افسانوی انداز اپنانے سے بیانیے مزیدقاری کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ بھارت کے مسلمانوں کی ابتر حالات کا ذکر کرنا بھارتی حکومت کی ہٹ دھرمی کو مزید واضح کرنا ہے مسلمانوں کا بھارت سے پاکستان ہجرت کرکے آنا اور اس مٹی پر قدم رکھنے کے بعد اپنے آپ کو جنت میں سمجھنا ان کے لئے بہت بڑی بات تھی کیونکہ اس سے قبل انہیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ ان سے کئی گنا زیادہ تکلیف دہ تھے۔ بلکہ یوں کہ سکتے ہیں کہ وہ آزادی کے پیاسے تھے۔اس سے قبل انہوں نے ایسی آزادی نہیں دیکھی تھی۔ پاکستان میں داخل ہوتے ہی رنج و عالم کے بادلوں کا چھٹنا اور ایک نئی فضا میں قدم رکھنا ان خاندانوں کے لئے نئی صبح کا تازہ جھونکا ثابت ہوا۔دوران ہجرت بھارتی سورماؤں کے اسلحے کا ڈر اورخوف کا یہ عالم تھا کہ سارے سفر میں مسلمانوں کا قافلہ ڈر اور خوف کی حالت میں رہا۔ مصنف مزید کہتا ہے کہ یہ سفر ان کے لئے ایک سمندر ہے اور اگر برصغیر کے مسلمانوں نے ان درپیش چیلنجوں کے سمندر میں تیرنا نہ سیکھا تو پھر کہاں جائیں گے۔آگے تو سمندر ہے اور سمندر کے آگے مزید سمندر ہیں۔

دراصل مصنف اس ناول میں بھارتی مسلمانوں کے اس المیے کو اشکار کررہے ہیں۔جو مادی و روحانی محرومیوں سے عبارت ہے۔ناول میں مصنف کا پیغام کشتیاں جلانے کی بجائے کشتیاں بنانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

انتظار حسین کے ناولوں کا جائزہ لینے کے بعد میرے لئے انکار کرنا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ میں نے انہیں ان ناولوں کے حوالے سے نہایت روشن خیال ادیب اور فلسفہ تاریخ کو لبرل روایت کا علمبردار سمجھا۔اصل میں انکے اکثر ناولوں میں انکے ہاں مجموعی لحاظ سے ''قوم وملی جدوجہد آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کے لئے جلوہ گری نمایاں اور بامقصد دکھائی دیتی ہے۔البتہ ان کو شتر بے مہار آزادی کا حامی ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔

عبداللہ حسین کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت:

اُردو ادب کی دنیا میں عبداللہ حسین ایک نامور اور معروف ومقبول ناول نگار کی حیثیت سے جانے

پہچانے جاتے ہیں۔ان کا اصل نام محمد خان تھا ۔آپ ۱۹۳۱ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔عبداللہ حسین کے ناول فنی لحاظ سے پختہ اور معنی خیز ہیں۔ انکا سب سے بہترین ناول اُداس نسلیں ایک طویل مگر جامع ترین ناول کہلاتا ہے۔ان کے دوسرے ناول اُداس نسلیں جتنی شہرت حاصل نہ کر سکے۔بتیس سال کی عمر میں لکھا جانے والا یہ ناول انہیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔انہیں اس ناول پر آدم جی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

اُداس نسلیں کے علاوہ انکے دیگر ناولوں میں باگھ، قید، رات،نشیب (کہانیوں کا مجموعہ) اور ایک انگریزی ناول Emigre Journey بھی لکھا۔انکا ایک غیر مطبوعہ ناول افغان گرل کے نام سے بھی ہے۔ ناول انغانستان کے حالات کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ جہاں تک عبداللہ حسین کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کے حوالوں کا تعلق ہے تو انکے ناولوں میں وہ ناول جو تاریخ سے متعلق ہیں ان میں واضح بیانیوں کے ذریعے تاریخی واقعات اور تاریخی وتہذیبی عناصر کو کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مستقبل میں جب بھی ناقدین کے درمیان ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی اہمیت اور ضرورت پر بحث اور گفتگو ہوگی تو زیر بحث آنے والے ناول نگاروں کی فہرست میں عبداللہ حسین کا نام بھی موضوع بحث رہے گا اور ساتھ ہی ان کے ناولوں میں شامل افسانوی بیانیوں کو سند کے طور پر پیش کیا جائے گا کیونکہ عبداللہ حسین نے اپنے اکثر ناولوں میں اپنی کہانیوں،قصوں اور تاریخی واقعات کو افسانوی انداز اپناتے ہوئے بیانیہ شکل دے کر قاری کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ اس کی مثال اُداس نسلیں و دیگر دوسرے ناولوں میں عام ملے گی۔اصل میں ناول اداس نسلیں تین حصوں پر مشتمل برصغیر کی جزوی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔یہ تاریخ نسلوں کی سماجی اور سیاسی زاویوں پر مشتمل ہے۔ ناول کا پہلا حصہ ''برٹش انڈیا'' غدر ۱۸۵۷ء سے پہلی عالمی جنگ سے ۱۹۱۴ء تک کے احوال کے بیانیوں پر مشتمل ہے۔دوسرا حصہ ''ہندوستان'' عالمی جنگ اول سے تقسیم ہند کے مختلف واقعات کے بیانیوں کو سموئے ہوئے ہے جبکہ ناول کا تیسرا اور آخری حصہ'' بٹوارہ'' تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے ابتدائی حالات کے بارے میں مختصر کہانی کی صورت میں ہے۔

ناول نگار نے اس ناول میں ہندوستان کی تاریخ کے ۹۰ سالہ دور کے چند ایک اہم واقعات کو بنیاد

بنا کر ناول مرتب کیا ہے جن میں ''جنگ آزادی کے حالات، انگریزوں کا مکمل راج، نوابوں کا عام طبقے میں داخلہ اور عام افراد کا نوابوں کے طبقے کا حصہ بننا، مسلم قوم کا جدید تعلیم سے متعلق رویہ، پہلی جنگ عظیم کے تناظر میں، برطانوی فوج میں جبری بھرتیاں، جنگ کے حالات، کانگریس کی سرگرمیاں، سوراج کی تحریک، غیر سیاسی اور دہشتگرد تنظیموں کا احوال، بٹوارہ ہندوستان، فسادات، پاکستان میں مفادات کے حصول میں مشغول طبقات نمایاں ہیں۔

اُداس نسلیں کی کہانی کا آغاز ہی برطانوی دور کے حوالے سے برصغیر کے لوگوں کے مایوس کن حالات کے بیانیہ سے شروع ہوتا ہے۔اس بیانیے کی ابتداانگریزوں کی عوام دشمنی سے ہوتا ہے۔جس کا ابتدائی بیانیہ انگریزوں کے ہاتھوں برصغیر کے عوام کا استحصال ہونا ہے جس کی وجہ سے ناول نگار اُداس دکھائی دیتا ہے۔اس اُداسی کو ناول نگار نے ناول میں انفرادی اداسی سے بڑھا کر اجتماعی اداسی بنا دیا ہے۔اداس نسلیں کے بارے میں محمد حسن عسکری کہتے ہیں:

> ''عبداللہ حسین نے اپنے ناول اداس نسلیں میں ہندوستانیوں کی اداسیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔غیر ملکی تسلط کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہندوستانیوں کی سوچ ان کے غم میں اضافہ کرتی ہے۔غلام کی سوچ آزاد سے مختلف ہوتی ہے''۔(۲۰)

اُداس نسلیں کے تمام بیانیوں میں عبداللہ حسین نے پہلی جنگ عظیم سے لیکر قیام پاکستان تک انگریزوں کی سازشوں اور سیاسی چالوں اور برصغیر کے لوگوں کے نفسیاتی مسائل اور معاشی حالات کو اسطرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا چونک جاتا ہے۔مزید عبداللہ حسین نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس قدر آدم نے آدم کی نسلوں کی نسلیں اُداس کر رکھی ہیں۔

اُداس نسلیں میں آگے چل کر مصنف نے برصغیر کے جاگیردارنہ نظام کی پروردہ ذہنیت کوانتہائی جامع انداز میں افسانوی بیانیوں کے ذریعے عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

باگھ عبداللہ حسین کا ایک ایسا شاہکار ناول ہے کہ جس کا بیانیہ پر اسراریت اور استعارے کو جنم دیتا ہے۔یعنی یہ ناول فنی لحاظ سے خوف کی علامت ہے جس کا مقصد خوف کو جنم دینا اور خوف کو برقرار رکھنا ہے۔مصنف کے ہاں اس ناول میں خوف سے خوف زدہ ہونا ہی کافی ہے بجائے اس کے کہ اسے کھول کر

TH 214138

نئے خوف میں مبتلا ہوا جائے۔مصنف ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

''پونچھ سمیت کوئی دس بیس ہاتھ لمبا ہوگا مجھے ٹھیک اندازہ نہیں ،میری سیدھ میں کھڑا تھا۔مجھے تو اُس کا سر یاد ہے،بڑے بڑے انگاروں جیسی آنکھیں۔اُس کا ماتھا کوئی تین چار گٹھ کا ہوگا۔شیر کا ماتھا دیکھنے کی چیز ہے،میدان کا میدان اور آگ سے بھری ہوئی آنکھیں''۔(۲۱)

باگھ میں باگھ سے متعلق بیانیہ باگھ کو ایک ایسا درندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جس کا تعلق بلیوں کے نسلوں سے،شیروں کے نسلی امتزاج سے مگر شیر نہیں ہے مصنف کے ہاں باگھ ایک خوفناک تصور ہے جو شیر سے طاقتور بھی ہوسکتا ہے تیز رفتار بھی اور خونخوار بھی مگر شیر کی فطرت کی ایسی عظیم الشان کمزوریاں بھی ہیں جو باگھ کو نصیب نہیں۔عبداللہ حسین کے باگھ کے استعارہ کو بے حد شعوری رویہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

عبداللہ حسین کے ہاں باگھ کا خوف ہر طرف پھیلا ہے۔باگھ ہر طرف موجود ہے مگر مصنف کوشش ہی نہیں کرتا کہ باگھ ہے بھی یا کہ نہیں اس کے ہاں ناول میں باگھ صرف ایک خوف کی علامت ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

قید پاکستان میں وقوع پذیر ہونے والے ایک سچے واقعہ پر مبنی ہے۔اس ناول کا بیانیہ ضیاء دور میں ایک ناجائز نوزائدہ بچے کی سنگساری سے متعلق ہے۔ ناول کا بیانیہ ایک خاص نقہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ قید کا موضوع باقی ناولوں سے یکسر مختلف ہے۔ناول کا بیانیہ کرداروں کے ذریعے مختلف حالات و واقعات کو پیش کرتا ہے۔

ناول کا بنیادی موضوع پیر پرستی اور جاگیرداری نظام کی خرابیاں ہیں۔مصنف کے نذدیک انسان کٹھ پتلی کی طرح ہے جسے ایک ہستی جس کے ہاتھ میں ساری کائنات کا نظام ہے۔ وہ اپنے اشاروں پر چلاتی ہے۔رضیہ سلطانہ ناول کا مرکزی کردار ہے۔اس کردار کے ذریعے مصنف بتانا چاہتا ہے کہ عورت کے ہاں جذبات و احساسات کی کمی نہیں اور پھر وہ بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔اس کے علاوہ وہ خود آگاہی کی دولت سے مالا مال اور اپنی ذات کو عام تصور نہیں کرتی۔

''ہم لوگ احساس کمتری لیکر پیدا ہوتی ہیں۔کوئی ہاتھ لگا جائے تو دوسروں کے منہ کی طرف دیکھتی ہیں۔مردوں کے منہ پر بال نکلتے ہیں تو فخر سے دنیا کو دکھاتے ہیں۔ہماری چھاتیاں نکلتی ہیں۔تو شرم سے سر جھکا لیتی ہیں۔خون جاری ہوتا ہے تو شرم سے جھک جاتی ہیں۔شادی کی رات گزرتی ہے تو شرم سے باہر نہیں نکلتیں۔اس سے بڑی غربت کیا ہوتی ہے''۔(۲۲)

ناول کا بیانیہ عورتوں کا مردوں کے ہاتھوں استحصال کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف کے عورتوں کا معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے آپ کو مردوں کے مقابل زندگی گزارنے اور ان کے ہر ظلم کا بھر پور جواب دینے کی صلاحیت اور ہمت کی داد بھی دیتا ہے۔ناول میں عورت کی انا کو مرد کے ظلم و جبر کے مقابلے میں فوقیت دی گئی ہے۔قید میں مصنف نے رضیہ کے کردار کو جامد نہیں کہا بلکہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ ایک ایماندار عورت ہے اس میں اور ایک بیوی میں بس اتنا فرق ہے کہ وہ شوہر کے بنا بچہ پیدا کرتی ہیں اور معاشرہ اسے ذلت و رسوائی دیتا ہے وہ ہر قسم کی ذلت اور محرومیوں کا شکار دکھائی دیتی ہے۔

نادار لوگ عبداللہ حسین کا طوالت کے لحاظ سے دوسرا بڑا ناول ہے۔اگر اُداس نسلیں کے ساتھ اس کا تقابل کیا جائے تو اُداس نسلیں زیادہ دلچسپ اور زیادہ بامعنی نظر آئے گا۔گو کہ اُداس نسلیں اپنے بیانیوں، موضوعات کی وسعت اور فلسفیانہ گہرائی کی بناء پر بلاشبہ ایک بڑا ناول ہی رہے گا۔مگر اس کے باوجود نادار لوگ میں دلچسپی کے پہلو زیادہ ہیں۔نادار لوگ وہ توانا ناول ہے جو اُداس نسلیں کے سایہ میں ہونے کی وجہ سے اپنی حیثیت نہ منوا سکا ناول کا بیانیہ ایک خاص خطے کے سیاسی حالات پر ہے۔یہ ناول مکالمے پر انحصار کرتا ہے۔اس ناول کے بیانیے اور مکالمے پنجاب کی سرزمین پر ۱۸۹۸ء سے لیکر ۱۹۷۴ء تک رونما ہونے والے واقعات پر مبنی ہیں۔

نادار لوگ کے بیانیوں کی زینت یا اس ناول کے بیانیوں کے عنوانات کا تعلق تقسیم سے قبل مسلم سکھ معاشرت کا باہمی میل جول و باہمی تعلق، فسادات اور دوقومی نظریہ، ملکی انتظام میں بدعنوانی، مہاجرین کی بحالی، کسان مزدور یونین اور خواہش انقلاب، بھٹہ مزدوروں کی نسل در نسل غلامی، فوج کا انتظامی نظام میں حد درجہ مداخلت، صنعت کاروں کا ملکی معاملات میں بڑھتا ہوا کردار، صحافتی استحصال، پیپلز پارٹی کا ارتقائی

سفر اور عوامی ذہن میں گھر کر جانا، پہلی عوامی حکومت کے کھوکھلے نعرے وغیرہ وغیرہ۔

نادار لوگ کے بیانیوں میں جہاں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں وہ محض سیاسی واقعات نہیں بلکہ وہ ناول میں ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔قصہ گوئی کو اعتبار بخشنے کے لئے مصنف نے ہئیت بھی الگ طرح سے بنائی ہے۔یعنی نادار لوگ میں بیانیہ اپنی ہئیت بدلتا رہتا ہے۔اس ناول کا آغاز ہی ناول کے اختتامی واقعات سے کیا گیا ہے جو ناول کا تعارفی حصہ بھی ہے۔ناول کی کہانی کو سیدھی رو کی بجائے آخری حصہ تھوڑا سا دکھا کر ناول کی کہانی شروع کی ہے جس کی وجہ سے ناول اپنا حسن برقرار رکھتے ہوئے قاری کی دلچسپی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

عبداللہ حسین کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کے حوالے سے سرسری سا تعارف پیش کیا گیا۔عبداللہ حسین کے ناول نادار لوگ میں افسانوی بیانیوں کے حوالے سے نادار لوگ کا تفصیلی جائزہ آئندہ آنے والے صفحات میں پیش کیا جائے گا۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت:

مستنصر حسین تارڑ پاکستان کے مشہور سفر نامہ نگار ہیں۔اب تک پچاس سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ان کی وجہ شہرت سفر نامے اور ناول نگاری ہے۔اس کے علاوہ ڈراما نگاری، افسانہ نگاری اور فن اداکاری سے بھی وابستہ رہے۔مستنصر حسین تارڑ پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب ہیں۔

سفر نامہ کے میدان میں اپنا سکہ جمانے کے بعد مستنصر حسین تارڑ ناول نگاری کی جانب آنے والے مصنفین میں سرفہرست ہیں۔انکا اولین ناول پیار کا پہلا شہر جس کے اب تک پچاس سے زائد ایڈیشن آ چکے ہیں یوں تو یہ ناول مقبول ٹھہرا البتہ راکھ اور بہاؤ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔مستنصر حسین تارڑ نے کئی ناول لکھے اور ہر ایک ناول کا بیانیہ ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد پایا گیا ہے۔لیکن لازم نہیں کہ ناول کے امتیازات کے حوالے سے ہر ایک ناول صنف اول کا ناول مانا جائے۔کیونکہ لازمی نہیں کہ کسی بھی مصنف کے سارے ناول یا سارے کا سارہ فن ایک جیسا نہ ہونے کے باوجود سارے کا سارہ فن ہی اچھا ہو۔کمی بیشی تو ہر ایک مصنف کے کام میں ہوتی ہے جس میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کسی ناول میں کرداروں کا چناؤ انتہائی جاندار ہوتا ہے تو ناول اسلوب کے لحاظ سے اعلیٰ ہوتے ہیں۔اسی طرح مستنصر حسین تارڑ کے

اگر چہ لکھے گئے ناول بہت اچھے ہیں مگر ان میں بعض ناول تو ہر لحاظ سے مکمل اور حقیقت پر مبنی دکھائی دیتے ہیں۔مثلاً ''راکھ'' اور بہـــــاؤ اپنے وقت کے بہترین ناول ہیں۔اس کے علاوہ انکے دوسرے ناول ان دو ناولوں کے مقابلے میں قدرے کم اہمیت کے حامل تصور کئے جاتے ہیں۔

بہاؤ مصنف کا ایک مشہور ناول ہے جس کا بیانیہ وادی سندھ کی تہذیب کو کھول کر قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔بہاؤ میں مصنف کا فن اپنے اوج پر دکھائی دیتا ہے۔ناول کا بیانیہ اتنا پر اثر، دلچسپی سے بھر پور اور تجسس پر مبنی ہے کہ قارئین اسے پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو حیرت کے دریا میں بہتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔حالانکہ ناول تخیل کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے لکھا گیا ہے یعنی اسکی بنیاد تخیل پر ہے۔لیکن قاری پڑھتے ہوئے انتہائی سرور کے عالم میں اسے حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔تخیل کی مضبوط سطح پر پہنچنے کے بعد یہ قدیم تہذیب میں نئی روح پھونک دیتا ہے۔جو کہ کسی بھی ناول نگار کے لئے انتہائی مشکل کام ہوتا ہے مگر مصنف نے اسے انتہائی آسانی کے ساتھ کر دکھایا۔اس ناول کی زبان انتہائی منفرد ہے۔اصل میں بہاؤ کا بیانیہ قدیم دریا سرسوتی کے معدوم اور خشک ہونے کے بیانیہ پر مشتمل ہے۔جس سے پوری تہذیب فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ اس ناول کے بُنت میں جن زبانوں سے کام لیا گیا ہے ان میں سنسکرت،سندھی، براہوی اور سرائیکی شامل ہیں۔

اس لئے ہر لحاظ سے بہـــاؤ کو بجا طور ہر اردو کا ایک بڑا ناول کہا جا سکتا ہے۔اس ناول میں انسان اور زندگی لازم اور ملزوم دکھائے گئے ہیں۔مصنف کے ہاں آدم کی پہلی تہذیب زرعی تہذیب تھی اور انسان کا اول شاہکار مٹی سے برتن سازی تھی۔پرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب نے لے لی ہے جس کی تخلیقیت آدمی کے ہونے سے وابستہ ہے۔یہی اس ناول کا مرکزی خیال ہے۔ناول کی حیران کن بات مصنف کا ہزاروں سال پرانی تہذیب کو بیانیہ کے ذریعے ہماری انکھوں کے سامنے کھڑا کر دینا ہے۔ان ناولوں کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ کے لگ بھگ دس اور ناول ہیں جو کہانی کے اعتبار سے تو اعلیٰ ہیں مگر انکے بیانیے اتنے اچھے نہیں ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کے حوالے سے سرسری سا تعارف پیش کیا گیا۔مصنف کے ناول راکـــــھ میں افسانوی بیانیوں کے حوالے سے آگے انیوالے ابواب میں باقاعدہ

تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

بیانیہ دراصل کسی تحریر یا فن پارے میں کوئی واقعہ یا مختلف واقعات کی ایک ترتیب ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے تہہ در تہہ کھلتے ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیانیہ اسلوب میں مصنف کسی واقعہ،قصہ،مطالعہ یا مشاہدے کو کہانی کے انداز میں پیش کرتا ہے اور اس میں کسی بھی تحریر کو جائز تصور کیا جائے گا۔بیانیہ میں مصنف کوئی واقعہ یا قصہ کرداروں ،مکالموں یا مختلف مناظر کے ذریعے پیش کرسکتا ہے یا پھر وہ کسی فن پارے میں بیانیہ کا پیرایہ تیار کرنے کے لئے داخلی خود کلامی کا سہارا بھی لے سکتا ہے۔بیانیہ جہاں رومانوی یا حقیقت پسندانہ ہوسکتا ہے تو دوسری طرف اس میں علامت اور تجرد کا استعمال بھی جائز ٹھہرتا ہے۔

مختصراً بیانیہ سے مراد ہر وہ تحریر ہے جس میں کوئی واقعہ یا واقعات بیان کیے جائیں۔بیانیہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس میں جو واقعات بیان ہوں وہ لامحالہ فرضی ہوں اگر یہ شرط لگائی بھی جائے تو بہت سے ناول بیانیہ کی سرحدوں سے باہر ٹھہریں گے۔اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ بیانیہ کو واقعات سے غرض ہے چاہے واقعات فرضی ہوں یا سراسر حقیقت پر مبنی ہوں اور نہ ہی اس سے یہ فرق پڑتا ہے کہ وہ واقعات کب ،کہاں اور کیسے اخذ کئے گئے ہیں۔اگر ادبی روایت پر نظر ڈالیں تو بہت سے ایسے ناول افسانے میری نظر سے گزرے ہیں کہ جن میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے یا پھر سچ اور جھوٹ کو کچھ اس قدر گھلا ملا کر پیش کیا گیا ہے کہ اس میں جھوٹ اور سچ کی تمیز اور فرق کرنا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سی بات ہے۔ اور پھر ایسے واقعات اور قصے بھی جو ہماری مذہبی کتابوں میں مذکور ہیں جن کی صدیوں پرانی روایات ہیں اور جن کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ اور مکمل یقین رہا ہے کہ وہ واقعات اور قصے سرتاسر سچ اور مبنی بر حقیقت ہیں پھر کیا ہم ان کو بیانیہ سے باہر کا حصہ مان لیں جو اب یقیناً نفی میں آئے گا کیونکہ بیانیہ محض واقعہ یا واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ بیانیہ اور افسانوی بیانیہ میں واضح فرق پایا جاتا ہے لیکن بعض اوقات اس فرق کو رواج نہیں دیا جات ۔بیانیہ اور افسانوی بیانیہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور ادبی لحاظ سے بھی اس کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔بیانیہ عام طور پر وسیع معنوں میں واقعات کی ایک خاص ترتیب کا نام ہے جس میں واقعات ایک خاص (Sequence) کے ساتھ چلتے ہیں ۔ان کا اسلوب خطابی کے بجائے ادبی ہوتا ہے جو خاص قسم کے واقعات کے تسلسل کے ساتھ ساتھ یکے بعد دیگرے تہہ در تہہ مختلف کردار ان واقعات کو واضح کرتے ہیں۔ یہ کردار ان واقعات کو آنے والے دیگر واقعات کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ بیانیہ کے اندر

کرداروں کا جاندار اور مضبوط ہونا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ کردار ہی کسی بھی بیانیہ کو واضح اور مکمل انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ناول کا مصنف ناول کے اندر واقعات کے کرداروں کو اتنے جاندار انداز میں پیش کرتا ہے کہ قاری جتنی مرتبہ بھی اسے پڑھے کا وہ اس سے لطف اندوز ہوگا۔اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیانیہ ناول میں رواج دینے والے تخلیق کاروں کے ہاں اردو ادب میں بہت ہی بعد میں آیا۔یا پھر یہ کہ سکتے ہیں کہ اس موضوع پر بہت ہی کم کام کیا گیا ہے۔ کیونکہ ناول لکھنے اور اس پر جانفشانی کے ساتھ کام کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ ماحول پر امن اور ساز گار ہو۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو یہاں پر وہ ماحول جو اس کے لیے ہونا چاہیئے تھا وہ میسر ہی نہیں تھا۔ ہاں البتہ بعد میں آزادی ملنے پر کچھ حالات بہتری کی طرف چلے اور ناول لکھنے کا رواج بڑھا۔اردو ادب میں ناول نے بہت بعد میں ترقی کی جس کی وجہ سے ناول کو وہ مقام نہ مل سکا جو دیگر زبانوں میں اس کو ملا ہوا ہے۔ وجود میں آنے کے بعد ناول کی طرف توجہ دی جانے لگی اور بہت سے ناول آزادی کے بعد لکھے گئے یا پھر لکھے جانے لگے۔اسی طرح زندگی سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی ایسا شعبہ جس کے ساتھ یا جس میں انسانی عمل دخل ہو بیانیہ سے حالی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہی بیانیہ ہے کہ جس کے ذریعے معاشرہ کے اندر پائی جانے والی تمام حالتوں اور رویوں کو کسی نہ کسی انداز میں پرکھا جاتا ہے خواہ ان رویوں کا تعلق معاشرے میں صحیح اور غلط کی پہچان یا پھر ثقافتی معیارات کے طے کرنے کے ساتھ ہو۔بیانیہ معاشرہ میں انسانی تعلقات سے ہو سبھی بیانیہ کے ذریعے ہی طے ہوتے ہیں۔ افراد کے دانش و حکمت معاشرتی تہذیب و ثقافت اسی بیانیہ کے مرہون منت ہیں۔معاشرتی زندگی میں جتنا عمل دخل بیانیے کا ہے شاید یہ کسی اور چیز کا ہو۔اس سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ بیانیہ معاشرہ کے کس کس حصے کو متاثر کرتا ہے یا پھر انسانی زندگی کے کون کون سے پہلوؤں کو بیانیہ متاثر کرسکتا ہے۔ جہاں تک افسانوی بیانیوں کا انسانی زندگی سے جڑے ہوئے مختلف شعبہ جات کا تعلق ہے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ افسانوی بیانیے کا تعلق افسانہ اور ناول کے ساتھ خاص ہے اور یہ دونوں زندگی کے ساتھ لازام و ملزوم ہیں۔کیونکہ افسانوی انداز اسلوب ناول اور افسانہ میں تقریباً ایک جیسا ہی ہے جس کی وجہ سے اسکی پہچان ہی ناول اور افسانہ کے واقعات اس کے کرداروں کی صورت میں نمایاں ہے ۔افسانوی بیانیے مختلف واقعات میں اپنی اہمیت کے لحاظ سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ واقعہ یا واقعات کو کسی افسانے یا پھر ناول میں بیان کرنا کوئی بڑی بات نہیں لیکن ان کو بیان کرنے کا انداز الگ معنی رکھتا ہے جو کہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے ۔اور یہ ہر ایک ناول نگار یا

پھر افسانہ نگار کے بس کی بات نہیں ہوتی ۔ناول کے بیانیوں میں ایک خاص قسم کی تاثیر پیدا کرنا ایک اچھے ناول نگار کی پہچان ہوتی ہے۔یعنی ناول نگار کا واقعات کے کرداروں میں تسلسل اور موقع کی مناسبت سے کرداروں کا چناؤ ،ان کرداروں کا گفتار کا متحمل ہونا بھی انتہائی ضروری ہوتا ہے جس سے ناول کے بیانیوں میں خوش اسلوبی اور کشش پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح افسانوی بیانیہ اپنا مقام خود بخود قاری کے دل میں بنا لیتا ہے اور یہی ایک بہترین ناول نگار کی پہچان ہوتی ہے۔

اردو ادب میں ناولوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ افسانوی بیانیہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے شروع ہوتا ہے جو کہ اب تک جاری ہے۔نذیر احمد کے ہاں افسانوی بیانیہ موثر انداز میں ملتا ہے کیونکہ مصنف نے اپنے ناولوں میں کہانی کو بیان کرنے کے لئے دیگر مصنفین کے برعکس نہ تو غیر ضروری مکالموں سے کام لیا ہے کہ جس سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو اور نہ ہی لمبی تمثیلوں کا سہارا لیا ہے۔اسی وجہ سے اردو ناول نگاری میں افسانوی بیانیوں کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر جاتا ہے۔یہی نہیں بلکہ تاریخ میں دپٹی نذیر احمد کا ایک اہم مقام ہے اور اردو ادب کے پہلے ناول نگار بھی کہلاتے ہیں۔اگر چہ مصنف نے صرف سات ناول لکھے مگر ان سات ناولوں نے ناول نگاری کے میدان میں اس دور کے دیگر ناول نگاروں کی فن ناول نگاری کی تخلیق میں ایک واضح فرق ڈال دیا۔ان کے زیادہ تر ناولوں کے بیانیے معاشرتی اصلاح سے متعلق ہیں۔اگر ان کے بعد عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے ناولوں میں افسانوی بیانیے اپنی جگہ ایک مقام تو رکھتے ہیں مگر نذیر احمد کے مقابلے میں کم درجے کے ہیں۔ان دونوں کے اکثر ناولوں کے بیانیے تاریخی ہیں جن میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کا ذکر ملتا ہے اور جو قاری کی تاریخ کے حوالے سے رہنمائی اور معلومات میں گراں قدر اضافہ کا باعث ہیں۔ان ناولوں کے بیانیے مسلم قوم کے حوصلے ،شجاعت،فراخدلی،مذہبی جوش اور ان کے روحانی ارتقاء کی تعریف و توصیف پر مبنی ہیں۔ ان کے تاریخی ناولوں میں حسن و عشق کے موضوعات کو افسانوی بیانیوں کا حصہ بناتے ہوئے قاری کے لیے دلچسپی اور تجسس کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔جس کو قاری مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور محضوض ہوتا ہے۔شرر اور رتن اپنے ناولوں میں زندہ کرداروں کی تخلیق کرنے والے مصنفین کہلاتے ہیں۔ان کے بعد آنے والوں میں قرۃ العین حیدر وہ ناول نگار ہیں کہ جن کے ناولوں کے بیانیوں میں ماضی اور حال کا تجربہ ایک ہی وقت میں ہوتا ہے۔مصنفہ کی کوشش رہی ہے کہ ان کے ناولوں کے بیانیوں سے اور انکے اپنے فکری

آہنگ سے مختلف النوع واقعات کی کڑیاں جڑسکیں۔اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس عظیم کارنامہ میں انکا کوئی شریک نہیں۔ انکی تحریروں نے اردو ادب کو ایک نئی اور اچھوتی شناخت دی۔ اردو کی یہ مایہ ناز ادیبہ جنہوں نے ناولوں کے بیانیوں کا ایسا بے بہا خزانہ،لفظوں کی کہکشاں،حسین جملوں کی بے مثال قمر پیکر چھوڑی ہے کہ جس کی مثال اردو ناول و افسانہ کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔اردو ادب کاایک اور نام عزیز احمد ہے جومذہبی افسانوی بیانیوں کے حوالے سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ان کے انہی تاریخی موضوعات نے ناول نگاری کے فن میں انہیں زندہ رکھا ہوا ہے۔انکے خاص ناولوں میں ایسی بلندی ایسی پستی،مرمراور خون،ہوس، گریزاور آگ شامل ہیں اسی لئے عزیز احمد کا شمار بھی تاریخی ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔عزیز احمد کے کئی ناولوں میں بیانیوں کی بجائے مکالموں سے کام لیا گیا ہے اور کسی جگہ تخیلانا انداز اپناتے ہوئے قصہ گوئی سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔مزید آگے چلکر ایک اور ادیب جن کا مزاج خالصتاً مشرقی رہا ہے جس کی وجہ سے انکی فکر وتکنیک بھی دیسی ہی رہی ہے لیکن نہ ہی انکا مطالعہ محدود ہے اور نہ ہی تخیل۔وہ انتظار حسین ہیں جو روسی اور انگریزی مطالعے سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور یہ انکے ناولوں کے بیانیوں اور مکالموں سے صاف ظاہر ہے۔انکی ناول نگاری میں بڑی خوبی انکا کہانی بُننے کا فن ہے۔انکے ناولوں میں بیانیہ انداز اسلوب بہت کم ہے لیکن ناولوں میں اپنا مقصد بیان کرنے کے لئے بیانیہ کے مقابلے میں مکالموں سے کام لیتے ہیں۔اگر کسی ناول میں بیانیہ سے کام لیا بھی ہے تو وہ بھی دیگر ناول نگاروں کے مقابلے میں مختلف دکھائی دے گا۔انکے مشہور ناولوں میں بستی، تذکرہ، چاند گہن، آگے سمندر ہے شامل ہیں۔ان کے ناولوں سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نہایت روشن خیال اور لبرل روایات کے حامی ہیں۔ان کے ہاں اکثر ناولوں کے چھوٹے موٹے بیانیے مجموعی لحاظ سے قوم وملی جدوجہد آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کے خوگر دکھائی دیتے ہیں۔جبکہ انکو شتر بے مہار آزادی پسند ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔بعد کے آنے والے ناول نگاروں میں عبداللہ حسین کا نام آتا ہے جوکہ ایک نامور اور معروف ومقبول ناول نگارکی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔انکے ناولوں کو پختہ اور معنی خیز کہا جا سکتا ہے۔ناول تو ان کے سب ہی اچھے ہیں مگر بلحاظ بیانیہ انکا ناول اُداس نسلیں ایک طویل مگر جامع ناول ہے۔اسی ناول ہی کی وجہ سے مصنف شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا۔ان کے تمام ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی لمبی فہرست دیکھی جا سکتی ہے۔انکے ناولوں میں تاریخی موضوعات بکثرت دیکھے جا سکتے ہیں۔انکے دیگر ناولوں میں باگھ،قید،رات،نشیب(کہانیوں کا مجموعہ)اورنادار لوگ شامل ہیں۔انکے ہاں تقریباً

تمام ناولوں میں بیانیہ انداز اسلوب ملے گا۔اس کے علاوہ انکے ناولوں میں تاریخی موضوعات واضح دیکھے جا سکتے ہیں جس میں تاریخی واقعات کو انتہائی اعلیٰ اور موثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے ۔آخر میں موجودہ صدی کے سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کا نام آتا ہے جس نے سفرناموں کے میدان میں سکہ جمانے کے بعد ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور آتے ساتھ ہی ناول نگاری کے میدان میں تہلکہ مچا دیا۔جہاں انکے سفر ناموں نے انکی شہرت میں اضافہ کیا وہاں ساتھ ہی ساتھ انکے ناولوں نے انکی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں سرفہرست ناول راکھ ہے جو تاریخی نوعیت کا ناول ہے انہوں نے کئی ناول لکھے مگر ہر ایک کا بیانیہ اسلوب دوسرے ناول کے اسلوب بیان سے قدرے مختلف رہا ہے جو اپنے بیانیوں کے حوالے سے شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔اس کے علاوہ بہاؤ ،اور پھر ایک لائن لگ گئی جن میں راکھ جیسا تاریخی ناول بھی شامل ہے۔مختصراً یہ کہ ان کے ہاں ہر طرح کے ناول تاریخی، مذہبی ،معاشرتی با آسانی لکھے گئے ہیں۔ان کا ہر ناول موضوع اور کہانی کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت کا حامل دکھائی دیگا۔جس سے ان کی شخصیت کو بخوبی پرکھا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ معین الدین جینا بڑے ،اردو میں بیانیہ کی روایت (ممبئی ،شعبہ اردو یونیورسٹی آف ممبئی ،۲۰۰۷ء)ص ۷

۲۔ ممتاز شیریں،تکنیک کا تنوع،مضمون: ماہنامہ شب خون (انڈیا، الہ آباد،شمارہ ۲۵۲ جنوری ۲۰۰۰ء)،ص ۵۷

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی،چند کلمے بیانیہ کے بیان میں،مضمون: ماہنامہ شب خون (انڈیا، الہ آباد،شمارہ ۲۵۲ جنوری ۲۰۰۲ء)،ص ۳۶

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی،چند کلمے بیانیہ کے بیان میں،مضمون: ماہنامہ شب خون (انڈیا، الہ آباد،شمارہ ۲۵۲ جنوری ۲۰۰۲ء)،ص ۶۸

۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی،چند کلمے بیانیہ کے بیان میں،مضمون: ماہنامہ شب خون (انڈیا، الہ آباد،شمارہ ۲۵۲ جنوری ۲۰۰۲ء)،ص ۶۷

۶۔ گوپی چند نارنگ،ساختیات،مشرقی شعریات (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ،۱۹۹۳ء)،ص ۵۳۱

۷۔ فیڈرک جی جیمز (Federek James) ،ساختیات،مشرقی شعریات (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی،۱۹۹۳ء)،ص ۱۳۳

۸۔ گوپی چند نارنگ،ترقی پسندی،جدیدیت (مابعد جدیدیت ،ممبئی: ایڈشاٹ پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء)،ص ۴۰۰

۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شب خون (انڈیا، الہ آباد: ۲۰۰۲ء)،ص ۱۷

۱۰۔ ژرار ژینت (Zarar Zenith) ،ساختیات،مشرقی شعریات (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ،۱۹۹۳ء)،ص ۱۲۴

۱۱۔ گوپی چند نارنگ،بیسویں صدی میں اردو ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص ۱۲۷

۱۲۔ گوپی چند نارنگ،بیسویں صدی میں اردو ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص ۱۲۷

۱۳۔ عزیز احمد،تیسری بار،ہوس،بدتر از گناہ (لاہور: مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۱ء)،ص ۱۶۲

۱۴۔ عزیز احمد،گریز (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء)،ص ۲۸۷

۱۵۔ عزیز احمد،گریز (دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۲ء)،ص ۱۶۳

۱۶۔ حسن عسکری، اردو ادب، شمارہ نمبر ۲ (لاہور: ۱۹۴۹ء)، ص ۱۶۱

۱۷۔ بیگم افضل کاظمی، اردو ادب کے پچیس سال، مشمولہ، افکار جوبلی نمبر، سال ۲۲ شمارہ ۴۔۳ ، (کراچی: ۱۹۷۰ء)، ص ۱۵۶

۱۸۔ ڈاکٹر انور پاشا، ہندو پاک میں اردو ناول۔ تقابلی مطالعہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء)، ۱۳۲

۱۹۔ وزیر آغا انتظار حسین کا تذکرہ، مشمولہ انتظار حسین: ایک دبستان، ترتیب ڈاکٹر ارتضی کریم (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص ۴۳۳

۲۰۔ عبداللہ حسین، باگھ (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء)، ص ۲۱

۲۱۔ حسن اختر ملک، تاریخ ادب اردو (لاہور: یونیورسٹی بک ڈپو، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۰۹۱

۲۲۔ عبداللہ حسین، قید (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۶۶

باب دوم

ناول ''راکھ'' میں اہم افسانوی بیانیوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

ناول زندگی کی تہہ در تہہ پرتوں کو الٹ کر مشاہدے و مطالعے کا نام ہے اور ایک اعلیٰ قسم کے ناول کی تخلیق کے لئے امن کا ہونا انتہائی ضروری ہوتا ہے ۔اردو ناول کو پاکستان کے قیام کے بعد فروغ ملا۔ اس کے ساتھ ہی اردو ناول نگاروں نے چند اعلیٰ درجے کے ناول لکھے اور یہ تب ممکن ہوا جب امن قائم ہو چکا تھا اور حالات و واقعات میں کسی قدر ٹھہراؤ آ گیا۔ چنانچہ اس دور میں جو ناول لکھے گئے ان میں آفاقی پہلو غالب دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ناول نگاروں نے اجتماعی شخصیت کو دریافت کرنے کی کوشش کی خواہ وہ قصہ کی صورت میں، کہانی کی شکل میں یا پھر بیانیوں کے انداز میں ہو۔انہوں نے ماضی میں جھانک کر اس خطے کے لوگوں کا مزاج متعین کرنے کی کوشش کی جس سے پتہ چلا کہ انکا عمومی موضوع کسی نہ کسی طرح معاشرہ ہی رہا ہے۔

ان ناول نگاروں میں مستنصر حسین تارڑ کا نام بھی شامل ہے ۔اپنے ناول راکھ کے مختلف بیانیوں کے ذریعے ہماری پچاس سالہ تاریخ کا مجموعی جائزہ پیش کیا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں ہماری پچاس سالہ تاریخ سانس لے رہی ہے۔ مصنف کے باقی ناولوں کی نسبت اس ناول میں زیادہ تازگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ناول کی ہر سطر ہمارے عروج و زوال کو بیان کرتی ہے۔ اس کے بیانیوں کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ راکھ پاکستان کی پچاس سالہ زندگی کے سیاسی اُتار چڑھاؤ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی نظام کے ڈھانچے کی شکست و ریخت ہے مزید مطالعے سے معلوم ہوگا کہ موضوعی اعتبار سے ناول کے اجتماعی ڈھانچے پر بھلے ہی مصنف کی گرفت مضبوط رہے یا نہ رہے وہ اپنی خوبصورت نثر کی جالی سے قاری کو آزاد نہیں ہونے دیتا۔ اس ناول کا موضوع ایک زندہ معاشرہ ہے اس لئے راکھ حقیقت کے قریب تر لگتا ہے کیونکہ ایک ناول نگار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ایک دلچسپ موضوع پیش کرے تاکہ عام انسانوں کو اس سے دلچسپی ہو۔ اور یہ تمام چیزیں کسی نہ کسی حد تک ناول راکھ میں موجود ہیں۔

مصنف نے اس ناول کے بیانیوں میں قوموں کے عروج و زوال، شرمندگی اور شکست کا اعتراف کرتے ہوئے ماضی کو حال کے ساتھ پیوست کیا ہے۔ناول میں پاکستان کے ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ کا دور بھی اپنے بیانیوں میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور جدید عہد کا پاکستان بھی اپنے بیانیوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ مصنف نے ہماری زندگی میں دکھ، کامیابی، خوشی اور ناکامی یعنی سارے حالات دکھائے ہیں اور ملک کی تقسیم اور اس کے بعد لوٹ مار کے نتیجے میں اعلیٰ عہدوں تک رسائی حاصل کر کے اپنے آپ کو اونچے طبقوں میں شمار کرنے والوں کی کھوکھلی زندگی کی منظر کشی بھی کی گئی ہے۔

لکشمی منشن کی تاریخی اہمیت :

ناول راکھ میں تقسیم ہند کے بعد کے حالات کو مصنف نے مختلف انداز میں افسانوی بیانیوں میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کے حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے پاکستان کے چند ایک تاریخی مقامات کے حوالے دیتے ہوئے ان علاقوں کی اہمیت اور مرتبہ کو افسانوی اسلوب میں قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ لکشمی منشن جو ماضی کے علاوہ جدید دور میں بھی اپنی خاص حیثیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ مصنف نے اپنے اس بیانیہ میں لکشمی منشن جو کہ کئی فلیٹوں پر مشتمل تھا کی اہمیت اور اس میں رہنے والے افراد کے باہمی میل جول کو بیان کیا ہے۔ مصنف راکھ میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

''گوالمنڈی اور لکشمی منشن دو الگ دنیائیں تھیں'' (۱)

لکشمی منشن لاہور شہر میں واقع کئی فلیٹوں پر مشتمل ایک تاریخی عمارت کا نام ہے جس سے کئی تاریخی یادیں وابستہ ہیں۔ اس سے جڑا ہوا ایک اور تاریخی مقام لاہور کی گوالمنڈی ہے۔ ان دونوں مقامات کو مصنف نے اپنے بیانیہ میں تاریخی حوالوں سے بیان کیا ہے۔ یہ دونوں مقامات اہمیت کے لحاظ سے الگ تھلگ واقع ہوئے ہیں اور ان کی حیثیت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ لکشمی منشن کے چار چفیرے فلیٹوں کی سیڑھیوں سے ذرا پہلے نوجوان لڑکے باغیچے کے تھڑوں پر بیٹھ کر مختلف قسم کے گیت منہ پھاڑ پھاڑ کر گاتے ہوئے دکھائی دیتے کیونکہ یہ لڑکے انگریزی فلموں کے دلدادا تھے اس لئے ان کے سٹائلز بھی اس نوعیت کے ہوتے تھے۔ یہ لڑکے جن میں شرارتی اور شریف زادے بھی تھے اپنی مستی میں ہمیشہ مگن نظر آتے ہیں۔ ان کی حرکات وسکنات کو مصنف نے کسی حد تک فکشن کے انداز میں قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ لکشمی منشن کو بیان کرنا مقصد نہیں بلکہ ان سے جڑی ہوئی یادیں اور ان یادوں سے وابستہ وہ تاریخی حوالے ہیں کہ جو آج بھی ہمیں ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ مختلف ناول نگاروں اور تاریخ دانوں نے اس منشن سے منسلک تاریخی یادوں کو اپنے اپنے انداز میں تاریخی انداز میں لکھا ہے ان سب لکھنے والوں سے الگ طرح سے لکشمی منشن کو فکشن کے بیانیوں کے ذریعے سے بیانیے میں پیش کیا ہے۔ زیر بحث بیانیہ میں لکشمی منشن کے فلیٹوں میں رہنے والے رہائشیوں کے کھیل کود کو بھی کسی حد تک دکھایا ہے اگر چہ شاید یہ اہمیت کا حامل نہ ہو مگر اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جس سے دلچسپی کا عنصر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مصنف اس سے ہٹ

کر ان مشاغل کا ذکر بھی انتہائی اعلیٰ انداز میں کرتا ہے جو فلیٹ کے رہائشی اپنے فارغ اوقات میں سرانجام دیتے تھے۔مصنف ایک جگہ ان مشاغل کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کرتا ہے :

''ادھر لکشمی منشن میں بھی یہی سٹائل فالو کیا جاتا تھا۔گیند اگرچہ آف پر وائڈ جا رہی ہے لیکن بیٹس مین گھٹنا ٹیک کر اسے لیگ پر ہی کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے'' (۲)

بیانیہ جہاں دیگر تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ لکشمی منشن کے فلیٹوں میں رہنے والے لوگوں کے معاشرتی حالات کو بھی اپنے بیانیہ میں شامل کرتے ہوئے فارغ اوقات میں ہونے والے ان مشاغل کا ذکر کرتا ہے جیسے عموماً ایک جگہ پر رہنے والے نوجوان فارغ اوقات میں کئی مشاغل سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔لکشمی منشن کے نوجوان دیگر کھیلوں کے ساتھ ساتھ کرکٹ بھی کھیلتے اور ان کے کھیلنے کا انداز بھی ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوتا جس کا ذکر مصنف نے انتہائی باریک بینی کے ساتھ کیا ہے۔

بیانیہ میں جہاں افسانوی انداز میں لکشمی منشن کے رہائشیوں کے پیار و محبت اور آپس میں میل جول کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ بعض اوقات ان کے باہمی رنجشوں کو بھی بیان کیا ہے مثلاً

''اگلے چند روز کے لئے لکشمی منشن کی صورتحال بے حد کشیدہ رہی۔۔۔بکرے نے پہلے تو کامل کی بنفس نفیس مرمت کی اور پھر اسکے والدین سے شکایت کی چنانچہ اثر صاحب نے اپنے اس لائق بیٹے کی گوشمالی کی۔مشاہد کے ہاں بھی شکایت کا سندیسہ آیا کہ آپ کا برخوردار محلے کے بزرگوں کے بیڈرومز کے نیچے کھڑے ہو کر بھری دوپہر میں با آبا آ کے نعرے لگاتا ہے چناچہ مشاہد کے ابا جی نے بھی اس کا کان پکڑ کر ''کیوں اوئے اُلو'' کہا تھا اور اس سے زیادہ سخت گیری ان کے لئے ممکن نہ تھی۔'' (۳)

شرارتیں لکشمی منشن کے نوجوانوں کا معمول تھیں ان شرارتوں ہی کی وجہ سے اکثر و بیشتر لکشمی منشن کے نوجوان اپنے والدین اور دیگر پڑوسیوں سے ڈانٹ اور مار بھی کھاتے رہتے اور بعض اوقات تو اچھی خاصی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑتا۔مصنف اپنے بیانیہ میں ان کی تمام شرارتوں سے پردہ اُٹھاتے ہیں لیکن

ساتھ ہی ان فلیٹوں میں رہنے والے افراد کے باہمی دوستی اور ان کی مشکلات کو بھی مختلف مناظر میں دکھاتا ہے۔بیانیہ میں مصنف کا مقصد کسی واقعہ کو یا اس واقعہ سے منسوب مسئلے کو صرف پیش کرنا نہیں بلکہ اس سے سبق آموز پہلو کو بھی قاری کی دلچسپی کے لئے کہانی کی شکل میں بیان کرنا ہے۔زیر بحث بیانیہ ممتاز شیریں کے بیانیہ کی تعریف کہ جس میں وہ بیانیہ کو واقعات بلکہ کئی واقعات کی ایک داستان کہتی ہیں جن کی ترتیب وار بیان ہونے کو بیانیہ کہا گیا ہے۔اس کے مطابق بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ اس بیانیہ میں تمام واقعات خواہ وہ واقعات مشاغل سے متعلق ہوں یا پھر لکشمی منشن کے رہائشیوں کے آپس کے تعلقات کے متعلق ہوں بالکل ترتیب وار بیان ہوئے ہیں یعنی یہ واقعات بقول ممتاز شیریں کے ایسے ہی ہیں جیسے کہ ایک کہانی تسلسل کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ ویسے بھی ایک ناول نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح تاریخی واقعات کو باقاعدہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ حقیقت کے انداز میں قاری کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ قاری کسی بھی طرح ان کو غیر حقیقی نہ سمجھے۔ اس سے ایک اعلیٰ ناول نگار کی فنی خوبی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

منشن اصل میں ایک خاندان تھا جس میں مسلمان ،پارسی،ہندواور سکھ سب ہی برابر کے حقوق رکھتے تھے بیانیہ میں ان کا کسی بھی قسم کا تفرقہ نہیں دکھایا گیا۔مذاہب الگ الگ ہونے کے باوجود ان میں پیار و محبت کا جذبہ پروان چڑھ چکا تھا جس کی وجہ سے منشن کے رہائشی اپنے آپ کو ایک خاندان تصور کرتے تھے اور دکھ درد میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ابھی پاکستان آزاد نہیں ہوا تھا تب سے یہ دوستی اور پیار و محبت عام تھا۔لکشمی منشن کے نوجوان طبقہ کو ایک خاص نام سے پکارا جاتا تھا اور وہ نام تھا لکشمی منشن کراوڈ۔اگرچہ آس پاس کے رہائشی علاقوں میں دوسرے نوجوان بھی رہائش پذیر تھے لیکن نوجوانوں کے اس ٹولے کو لکشمی منشن کی وجہ سے ایک خاص نام دیا گیا تھا کیونکہ اب یہ ایک خاص تاریخی مقام حاصل کر چکا تھا۔کئی مصنفین نے اس لکشمی منشن کو اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے اور نہ جانے کتنی اہمیت اور مرتبہ بیان ہوا ہوگا مگر جس اسلوب اور حسن نگارش اور فنی مہارت کے ساتھ مستنصر حسین تارڑ نے اسے افسانوی بیانیہ میں بیان کیا ہے جس کی کہانی کسی بھی مقام پر نہ تو تھکاتی ہے اور نہ ہی قاری کی دلچسپی میں کمی لانے دیتی ہے۔اسی وجہ سے اس ناول کے بیانیے دوسرے ناولوں کے بیانیوں کے مقابلے میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔جیسا کہ مصنف کے ہاں اس لکشمی منشن کو اس وقت مزید پزیرائی ملی جب یہاں فلم کی

شوٹنگ کی غرض سے بھوانی جنکشن کی ٹیم آئی تھی۔جس کی وجہ سے مصنف نے لاہور کی شکل وصورت کی تبدیلی کو اپنے ناول کے بیانیہ میں ذکر کیا ہے:

''بھوانی جنکشن کی آمد نے لاہور ریلوے سٹیشن کا چہرہ مُہرہ بدل دیا۔عمارت کے ماتھے پر تانگہ سٹینڈ کے عین اوپر لاہور کی بجائے بھوانی جنکشن پینٹ کر دیا گیا۔جہاں جہاں سائن بورڈ تھے ان پر بھی اس نامانوس شہر کا نام لکھا گیا۔'' (۴)

ویسے تو لکشمی منشن کے رہائشیوں کی زندگی قدرے سکون سے گزر رہی تھی مگر بھوانی ٹیم کی آنے کے بعد یہ لوگ منشن کے عام ماحول سے نکل کر اب ذرا کھلے اور پررونق ماحول کے مزے لینے لگے۔یعنی ان کے ہاں اب ہنسی مذاق اور دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ اس ٹیم کے ساتھ مانوسیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ایک موقع پر جب یہ ٹیم واپس جا رہی تھی تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے لاہور کی رفتار سست اور لاہور خالی خالی ہے۔مصنف بھوانی ٹیم کی واپسی کا لاہور پر جو اثر ہوا اُسے اپنے بیانیے میں اس طرح لکھتا ہے کہ لاہور مدتوں بعد بھی سنبھل نہ سکا۔بقول مصنف اس کے آسمان میں روشنی کم ہوئی اور روڈ پر تانگوں کی رفتار سست ہوگئی تھی یعنی وہ خوشیاں اب ماند پڑ گئی تھیں اور ہر طرف غم کا عالم تھا۔اس منشن میں رہنے والے غیر مذہب رہائشیوں کے آپس میں پیار محبت کو بھی مصنف ان الفاظ میں لکھتا ہے:

''بندو رام اسی گلی میں ایک ٹوٹی کھٹارا چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا رہتا تھا۔۔۔صرف ایک دھوتی میں ملبوس ۔۔اوبندو رام تم تو ہندو ہو تو پھر ہندوستان کیوں نہیں جاتے۔۔اور وہ اپنے تمباکو کی زردی والے دانتوں کے ساتھ ہنسنے لگتا۔۔اوئے یہ میرے گھر کا دروازہ ہے میں تو اس کے اندر بھی نہیں جا سکتا ہندوستان کیسے جاؤں ۔۔۔ذرا دھکیل کر دیکھو شاباشے۔'' (۵)

لکشمی منشن کے ساتھ مانوسیت ہندو بندو رام کی محبت اور اپنے گھر کی دہلیز سے اُنس نے مذہب اور رنگ ونسل کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مقابلے میں اتنا پختہ اور مضبوط کر دیا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اس کے دل میں گھر نہ کر سکی تھی۔یعنی مصنف قاری کو اس تاریخی حقیقت سے بھی آشنا کرنا چاہتا ہے کہ کس طرح ایک غیر مذہب اپنے پڑوسیوں کے ساتھ پیار ومحبت کے بندھن میں بندھا جا چکا ہے جسے اب

کسی مذہب یا پھر کسی بھی اور طاقت کی مدد سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ یہاں محبت ان تمام طاقتوں اور قوتوں پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔

منشن کے نوجوان اب بڑی عمروں کو پہنچ چکے ہیں منشن کی حالت بھی تبدیل ہو چکی ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ اب وہ حالات نہیں رہے۔ سب کچھ تبدیل ہو چکا تھا اسی کا ذکر مصنف ایک جگہ لکھتا ہے :

''لکشمی منشن اب وہ نہیں رہا تھا جو کہ پہلے تھا۔

اس کی بوسیدہ اینٹوں ،گرد آلود گراؤنڈ اور بالکونیوں میں بیٹھی لڑکیوں میں تبدیلی آچکی تھی۔اُس پر جو وقت گزرا تھا اسے تبدیل کر گیا تھا۔فلیٹوں کی سیڑھیوں کے تھڑوں پر اب لڑکے کم بیٹھتے تھے۔ بیٹھتے تھے تو ذرا شرمندہ ہو کر اور اس آزادی سے بالکونیوں کی جانب نہیں دیکھتے تھے جیسے دیکھا کرتے تھے۔'' (۶)

اگرچہ منشن کی حالت تبدیل ہو چکی ہے مگر رہائشی اب بھی اپنے فلیٹوں میں رہائش پذیر دکھائی دیتے ہیں اب کی اس تبدیلی کی وجہ سے نوجوان نہ تو ان تھڑوں پر زیادہ بیٹھتے تھے اور نہ ہی ان بالکونیوں کی طرف دیکھتے تھے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی قدرتی امر ہے لیکن یہاں کی تبدیلی کچھ تو قدرتی تھی اور کچھ حالات کے تھپیڑوں کی وجہ سے آئی چونکہ اب وہ نوجوان وقت کے ساتھ ساتھ Maturel ہو چکے تھے یعنی وقت کے ساتھ ساتھ منشن کے باسی اب سنجیدہ اور بالغ ہو چکے تھے۔ اب وہ لچھر پن بھی نہ رہا تھا ان کی حالت اب بھی اگر چہ ایک خاندان کی سی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ حالات نے اُن کی زندگی تبدیل کر دی تھی ۔

ان کے رویوں اور دیگر معاملات میں بہت زیادہ تبدیلی آچکی تھی لیکن منشن کا ماحول اب بھی پُر خلوص اور محبت بھرا تھا یعنی یہی چیز ان کے درمیان پل کا کردار ادا کر رہی تھی۔جس سے آج بھی لکشمی منشن کا نام ہر ایک کے لئے جانا پہچانا سا لگتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے حالات اور کامونکی کے ریلوے سٹیشن پر لاشوں کی سڑاند:

مصنف نے جہاں آزادی سے قبل کے حالات کا کسی حد تک اپنے بیانیوں میں ذکر کیا ہے لیکن زیادہ تر راکھ کے بیانیے آزادی کے بعد کے مسائل کے بارے میں ہیں۔ان بیانیوں میں جن تاریخی

واقعات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں خاص کر کامونکی کا ریلوے سٹیشن ہے کہ جس کو مصنف نے بہت ہی اعلیٰ افسانوی انداز میں پیش کیا ہے۔کامونکی جوکہ پنجاب کا شہر ہے آزادی کے دوران یہاں کے حالات اس وقت زیادہ خراب ہوئے جب پاکستان دُنیا کے نقشہ پر پہلی مرتبہ دکھائی دینے لگا تھا اور سورج کی پہلی کرن اس پاک سرزمین پر پڑنے لگی تھی۔مصنف کے بیانیہ میں کامونکی کو تاریخی حوالے سے ان واقعات کے ضمن میں مناظر کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔کیونکہ جہاں بیانیہ زندہ لوگوں کے بارے میں تاریخی حوالے سے ان کے حالات بیان کررہا ہے وہاں بیانیہ افسانوی اسلوب میں اُن مُردوں کے بارے میں بھی بیان کر رہا ہے کہ جو آزادی کی بھینٹ چڑھ گئے یا ان فسادات کی نذر ہوئے جو آزادی کے دوران رونما ہوئے تھے۔اس قسم کے تاریخی واقعات کسی نہ کسی طرح تاریخ کا حصہ ہیں لیکن ان تاریخی واقعات کو جو خاص کر ہمارے اس خطے سے تعلق رکھتے ہیں کو فکشن کے انداز میں بہت کم مصنفین نے بیان کیا ہے۔زیر بحث بیانیہ بھی انہی حالات کے بارے میں ہے کہ جو ہمارے خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔کامونکی شہر کے ریلوے سٹیشن سے متعلق ایک جگہ ناول کے بیانیہ میں مصنف لکھتا ہے:

''اسی لئے تو لیکر جانا ہے۔۔۔دیکھتے ہیں تمہارا ساہ کتنی دیر چلتا ہے۔۔۔''

ٹیشن پر۔۔۔کامونکی سٹیشن پر دو روز پیشتر ایک ٹرین روکی گئی تھی۔۔۔اس ٹرین میں اپنے گھر چھوڑ کر جانے والے تھے۔اور گھروں میں بوڑھے، بچے، جوان ۔۔عورتیں اور مرد بھی ہوتے ہیں اس ٹرین میں بھی تھے۔'' (۷)

جہاں بھی کسی واقعہ کے ساتھ تاریخی حوالے آئیں گے تو وہاں پر مصنف ان حوالوں کے لئے ان تمام واقعات کو منظر عام پر لائے گا کہ جن کا ان تاریخی واقعات کے ساتھ قریبی تعلق جڑ سکتا ہو۔اسی طرح کامونکی کے ریلوے سٹیشن کا جہاں تک تعلق ہے وہاں پر مصنف ۱۹۴۸ء کے ان ہجرت کے واقعات کو انتہائی باریک بینی کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ قاری کو ان میں ذرہ برابر بھی کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ بیانیہ اگر چہ کسی بھی قسم کا ہوسکتا ہے مگر یہ چلتا ایک ہی ڈگر پر ہے یعنی اس کا کام یا اس کے ذریعے اصل کہانی کو ہر حالت میں قاری تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے خواہ یہ تاریخی واقعات حقائق پر مبنی یا کسی کے حق میں ہوں یا نہ ہوں۔ جیسا کہ اس بیانیہ میں کامونکی ریلوے سٹیشن کا دلخراش تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔یہ ریل گاڑی کامونکی ریلوے

سٹیشن پر روکی گئی تھی جوکہ بھارت جانے کے لئے تیار تھی مگر ان کے مسافروں کی حالت یہ تھی کہ انہیں انتہائی بے دردی سے پاکستان میں قتل کر دیا گیا تھا۔جن کی اکثریت ہندو اور سکھوں پر مشتمل تھی۔سٹیشن کہ جسے مسافروں کے لئے بنایا جاتا ہے وہاں بقول مصنف کھلی قبروں کا نظارہ پیش کر رہا تھا کیونکہ مسافروں کو اتنی بے دردی سے قتل کیا گیا تھا کہ کئی دنوں تک ان کی لاشیں پڑی رہنے کی وجہ سے بدبودار ہو چکی تھیں۔

مصنف نے اس موقع پر سکے کے دو رخ بیان کیے ہیں وہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ ہجرت کسی بھی مذہب،علاقے اور ملت و قوم کے لوگ کریں انہیں اتنی بے دردی سے مارنا کسی بھی مذہب میں جائز نہیں ہے۔ مہذب قوموں کے ہاں اس قسم کا برتاؤ روا رکھا جانا مناسب نہیں بلکہ یہ سراسر انسانیت کی توہین ہے۔دوسری طرف مصنف ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے کہ جو دولت کی لالچ اور حرص میں سارے کے سارے حدود و قیود پار کر چکے تھے جو اس حد تک اندھے ہو چکے تھے کہ مذہب ،انسانیت کا پاس نہ رکھ سکے۔

زیر بحث بیانیہ ،بیانیوں کے ان تمام اصولوں اور قواعد پر پورا اترتا ہے کہ جو ایک بیانیہ کے لئے لازمی ہوتے ہیں یعنی اس بیانیہ کی کہانی اور قصہ جو بھی سمجھ لیا جائے ایسا ہی ہے کہ جیسے اسے ہونا چاہیے جس میں بات کو منطقی انجام تک پہنچایا گیا ہو یا پہنچایا جائے۔ یہاں وہی کہانی اور قصہ گوئی کا انداز اپنانے اور بات کو اپنی منتقی انجام تک پہنچا کر ختم کیا گیا ہے۔بقول معین الدین جینا بڑے ایک بیانیہ واقعات ،کردار ،واقعات کے تسلسل اور گفتار و عمل کے متحمل ہونے سے بنتا ہے۔اس قول کے مطابق موجودہ زیر بحث بیانیہ ہر لحاظ سے درست اور حقائق پر مبنی ہے۔ اس بیانیہ کے کرداروں کا اگر جائزہ لیں تو اس کے کردار زندہ و جاوید دکھائی دیتے ہیں۔کردار منفی اور مثبت دونوں ہو سکتے ہیں۔ جیسے مصنف پاکستانیوں سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کے اس کردار کو بیان کرتا ہے کہ جو دولت اور حرص کی لالچ میں کا مونکی ریلوے سٹیشن پر اپنی حرکات سے زمانے والوں کو انسانوں کے روپ میں جانور دکھائی دیتے ہیں۔ مصنف نے ان پنجاب کے لوگوں کو چور اور لٹیرے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے جو کا مونکی ریلوے سٹیشن پر زندہ تو زندہ مردوں سے زیورات اور کپڑے تک نوچنے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ اس بیانیہ میں جتنا ظلم ہندوؤں کے ساتھ پنجاب کے لوگوں نے روا رکھا شاید ہی کسی اور ناول یا تاریخی کتاب میں اس کا ذکر ملتا ہو اگر چہ مصنف نے غیر جانبدار ہونے کی بہت کوشش کی ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ جیسے مصنف پاکستان سے نہیں بلکہ بھارت سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض اوقات تو بیانیہ پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پاکستانی قوم

خاص کر پنجاب کے لوگ انتہائی ظالم اور ہندو انتہائی مظلوم قوم ہیں۔ حالانکہ یہ بات صرف اور صرف اس بیانیہ کی حد تک محدود دکھائی دیتی ہے۔ بیانیہ کے خول سے باہر نکلنے کے بعد اور دوسرے اس قسم کے ناول پڑھنے کے بعد اصل حقائق سامنے آجائیں گے۔ مصنف ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

''اب پچھلے دو روز سے وہ ٹرین ویران پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اس میں بوڑھے، بچے، جوان۔۔۔عورتیں اور مرد سبھی گلتے سڑتے بدبو دے رہے تھے اور تیز دھوپ میں کچھ جو پلیٹ فارم پر پڑے تھے وہ عجیب مزاحیہ زاویوں میں اکڑے ہوئے تھے۔۔خون کب کا خشک ہو چکا تھا۔'' (۸)

مصنف بیانیہ میں اپنی فنی خوبیوں اور مہارت کے جوہر دکھاتے ہوئے ان واقعات کو قاری کے لئے اس حد تک دلچسپ بنانے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتا ہے کہ کسی نہ کسی مقام پر قاری کے دل میں ان ہندؤں کے لئے رحم و ہمدردی کا ظہور ہونے لگے۔ حالانکہ ان سے کئی گناہ بڑھ کر زیادتیاں پاکستان کی مخالفت میں اس خطے کے مسلم آبادی کے ساتھ ہجرت سے قبل اور ہجرت کے دوران روا رکھی گئیں۔مگر زیر بحث بیانیہ میں مصنف نے کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ ملبہ پنجاب کے مسلمانوں کے کھاتے میں لکھ دیا جائے ۔مصنف کے بقول یہ سب کے سب ہندو جو ٹرین میں سفر کر رہے تھے نہتے اور بے گناہ تھے جنہیں پنجاب کے باسی مسلمانوں نے انسانیت کو ایک طرف رکھتے ہوئے ظلم و جبر کا نشانہ بنایا اور یہاں تک کہ لاشوں کو بھی نہ بخشا۔ بیانیہ تو بہت اچھا اور ترتیب کے مطابق چل رہا ہے مگر اس بیانیہ کے اس حصے پر کتنا اور کس حد تک یقین کیا جائے یہ سب ہم ناول پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں جو بھی وہ فیصلہ کریں۔مصنف کے مطابق لاشوں کی سڑاند سٹیشن سے اُٹھ کر قریب کے گھروں تک محسوس کی جاتی تھی اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ کچھ لوگ جو کہ انتہائی لالچی اور انسانیت سے کوسوں دور کہ جنھوں نے اس گھناونے عمل کے لئے سٹیشن کا رخ کیا اور اپنی ناک پر کپڑا ڈال کرتا کہ بدبو سے محفوظ رہا جا سکے اور اس طرح یہ کھیل کھیلا جو کہ انسانیت دیکھ کر شرما جائے۔اس قسم کا سلوک جوان لاشوں کے ساتھ روا رکھا گیا ایک مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا اور پھر یہ کسی ایک شخص کی ذاتی حرص و لالچ تو ہوسکتی ہے کہ انہوں نے ہندو خواتین سے گھگھرے اُتارے لیکن مجموعی عمل ہرگز نہیں ہوسکتا جس طرح اس بیانیہ میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

بیانیہ میں جہاں انسانوں کا انسانوں کے ساتھ ناروا سلوک بیان کیا گیا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ انسانوں کے ساتھ رہنے والے جانوروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے ۔ایک ایسے کتے کے بارے میں مصنف لکھتا ہے کہ اس نے بھی اپنا حصہ وصول کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا اور اس سڑاند میں سے اپنے وزن سے زیادہ انسانی لاش کو گھسیٹ کر ایک طرف لے جا رہا ہے۔ یہاں ناول نگار بتانا چاہتا ہے کہ انسان تو انسان یہاں کے کتوں نے بھی ان ہندوؤں کی لاشوں کو نہ بخشا۔ ہندوستان سے براستہ لاہور آنے والی ٹرین کا موازنہ پاکستان سے ہندوستان جانے والی ٹرین سے کیا گیا ہے اس بیانیہ میں ایک مقام پر مصنف لکھتا ہے کہ:

> ''اس نے پہلی بار پلیٹ فارم سے پرے لاہور والے پھاٹک کی طرف دیکھا۔وہاں ایک اور ٹرین رُکی ہوئی تھی۔لیکن اُس میں لوگ تھے اور زندہ تھے۔بہت عجیب بات ہے کہ دونوں ٹرینوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں ویرانی ہے اور کوئی نظر نہیں آتا اور اس کے باوجود لاہور سے آنے والی ٹرین مردہ نہیں لگتی۔۔۔اور یہ ٹرین بغیر انجن کے جیسے سر کے بغیر ایک لاش ۔۔۔یہ زندہ نہیں لگتی۔''(۹)

مجھے معلوم نہیں کہ کس حد تک یہ تاریخی بیانیہ واقعات کے لحاظ سے حقیقت پر مبنی اور سچائی کے ساتھ قاری تک پہنچا ہوگا لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں مصنف نے ہندو اور پاکستانی قوم کے ہاں انسانیت کے اس رشتہ کو جس طرح بیان کیا ہے شاید یہ کسی اور ناول نگار نے اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہو اور یا اتنی باریک بینی سے ان واقعات کو دیکھنے یا دکھانے کی کوشش کی ہو یا یہی واقعات کہ جن کے مناظر بیانیہ کے افسانوی انداز میں ایک قاری تک پہنچے ہیں کس حد تک درست اور حقیقت پر مبنی ہو سکتے ہیں۔رائے کسی بھی مصنف کی کسی بھی طرح کی ہوسکتی ہے لیکن اصل بات جو وہ بیان کرتا ہے وہ کس حد تک حقیقت کے قریب تر ہوسکتی ہے۔ یہ فیصلہ تو ایک قاری ہی بہتر طور پر کرسکتا ہے۔اگر کسی حد تک اس بیانیہ میں موجود واقعات کو سچ مان بھی لیا جائے کہ مسلمانوں نے ہندو بچوں ،عورتوں اور مردوں کے ساتھ اتنا ظلم کیا ہوگا مگر کیا ہم اس حقیقت سے منہ موڑ سکتے ہیں کہ یہ تو ایک ناول میں تاریخی واقعات کو بیان کیا گیا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں تاریخ لکھنے والے مصنفین کی برصغیر کے تقسیم کے حوالے سے لکھی گئی تاریخ کی سچائی اس کے بالکل برعکس ہے کہ جس میں ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو زندہ ٹرینوں میں اور کرپانوں کے ذریعے

موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔آج بھی ہندو اور سکھوں کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس کی مثال ہندوستان کے اندر رہنے والے مسلمان اور کشمیر کے مسلمان کہ جو آج تک مسائل اور خاص کر ہندوؤں کے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔کاش کہ کوئی مذہب کو ایک طرف رکھ کر دونوں قوموں کا دوران ہجرت موازنہ کرے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

شاہ عالمی جو کہ اپنے خاص پرانے طرز کے دروازے کی وجہ سے برصغیر کی تاریخی عمارات میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔راکھ کے مصنف نے بیانیہ میں جہاں شاہ عالمی کی حیثیت بیان کی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ اس کی وہ حیثیت کہ جس کی وجہ سے اس کی شہرت ہے اس کو بھی اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے اس سے جڑے ہوئے وہ تمام واقعات کہ جو وقوع پذیر ہوئے اور تاریخ کا حصہ بن گئے انہیں خصوصی طور پر بیانیہ کی کہانی میں پیش کیا ہے۔شہر قدیم لاہور کے جنوب کی سمت موچی دروازے اور لوہاری دروازے کے درمیان شاہ عالمی دروازہ واقع ہے جیسا کہ یہ دروازہ اورنگزیب کے بیٹے معظم شاہ کے نام سے موسوم ہے۔قبل ازیں اس دروازے کو کسی اور نام سے پکارا جاتا تھا ایک روایت کے مطابق اس دروازے کا پرانا نام بھیر والا دروازہ تھا۔

شاہ عالمی ثقافتی لحاظ سے تاریخ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی ۔اندرونی شاہ عالمی دروازے بھی ماضی میں اہم ثقافتی و تاریخی اہمیت کے حامل رہے ہیں اس کی اہم عمارات میں پری محل ،رنگ محل،لال مسجد مسجد ایاز اور باؤلی باغ جیسی عمارتیں ہیں۔جنہیں پرانی عمارات کا بیش قیمت خزانہ کہا جاسکتا ہے۔دیکھا جائے تو شاہ عالمی ایشیا کی سب سے بڑی کپڑے کی منڈی ہے جو ہزاروں دکانوں پر مشتمل ہے اور پورے ملک سے تاجر یہاں سے روزانہ کروڑوں کی تجارت کرتے ہیں بلکہ صرف یہی نہیں سٹیل ،تانبے کے برتن اور دیگر دھاتی سامان کے لئے بھی شاہ عالمی منفرد مقام رکھتا ہے۔شاہ عالمی خواتین کی دلچسپی کے لئے بھی مشہور ہے جن میں سوہابازار جو سونے کے زیورات ،کنارے بازار جو گوٹا کناری،گمٹی بازار اور ڈبی بازار جو کہ چوڑیوں کے لئے بے حد مشہور ہیں اور خواتین کی توجہ کا مرکز ہیں۔اکثر خواتین شادی بیاہ کی اشیاء اسی شاہ عالمی سے ہی خریدتی ہیں۔بیرونی شاہ عالمی دروازے سے رنگ محل تک کا سارا علاقہ بین الاقوامی تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔یعنی روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی تمام اشیا یہاں دستیاب ہیں۔تجارتی لحاظ سے رنگ محل کا علاقہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

جہاں شاہ عالمی کی تاریخی اہمیت بیان کی گئی ہے وہاں اس کے بعد اس کے ساتھ کیا واقعہ رونما ہوا کہ جس کی وجہ سے اس کی شکل ہی بدل دی گئی اگر چہ اب بھی یہ تاریخی اہمیت کا حامل علاقہ ہے مگر اس کی پرانی طرز کی عمارات کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ مصنف اس کی تباہی سے متعلق لکھتا ہے کہ:

''شاہ عالمی دروازے کے اندر واقع ایک وسیع اور قدیم آبادی کو آگ لگا دی گئی۔ یہ بھی ایک ناممکن کارنامہ تھا۔ ہندو شاہ عالمی دروازے کو مکمل طور پر بند کر کے محصور ہو چکے تھے اور اس علاقے کے اندر چڑیا بھی نہیں جا سکتی تھی لیکن ایک جاں باز مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ نے جان پر کھیل کر چند مزید جاں بازوں کو شاہ عالمی کے زیر زمین گندے نالے کے ذریعے اندر پہنچایا اور انہوں نے اطمینان سے سکونت پذیر کافروں کے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگا دی۔''(۱۰)

فضاء دھوئیں سے آلود تھی ۔۔۔گلی کوچوں میں ہو کا عالم تھا اور لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے تھے جیسا کہ عموماً ہوتا ہے جب کسی جگہ اچانک آگ لگ جاتی ہے یا کوئی سانحہ رونما ہو جاتا ہے تو لوگ سہم جایا کرتے ہیں۔ شاہ عالمی سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، یہ وہ شاہ عالمی تھا کہ جہاں خوشبوؤں سے گلیاں مہکتی اور چہروں پر مسکان لئے افراد خوشیوں کے گیت گنگناتے تھے تقسیم ہند کے وقت ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ شہر فسادات کی لپیٹ میں آچکا تھا اور شاہ عالمی جل رہا تھا۔ شہر قدیم کا تاریخی شاہ عالمی دروازے کا علاقہ تقسیم کے وقت لگائی جانے والی آگ کی نذر ہو گیا۔ بیانیہ شاہ عالمی کے ترتیب وار واقعات کو تو باقاعدہ طور پر پیش کرنے سے قاصر ہے مگر کہانی کی سمجھ اور ان کے واقعات اچھے خاصے واضح ہیں۔ مصنف کے بقول غیر جانبدارانہ رویہ اپناتے ہوئے شاہ عالمی کی تباہی اس وقت کے مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ کے سر لگاتے ہیں خیر نقصان نقصان ہوتا ہے کسی کے ہاتھ سے بھی ہو۔

بیانیہ کے مطابق شاہ عالمی میں اس وقت رہائش پذیر ہندو برادری کی بے دخلی اور ان کے گھروں کو لوٹنے اور ملیا میٹ کرنے سے ایک علمی ثقافتی ورثہ کی تباہی کو بیان کیا گیا ہے۔ شاہ عالمی کی وہ خوبصورتی جو تقسیم ہند سے قبل کی تھی اب وہ نہیں رہی اس کی یہ حالت تقسیم کی وجہ سے ہوئی حالانکہ یہی لوگ تقسیم سے قبل ایک ہی مقام پر رہتے تھے جن کا جینا اور مرنا اکھٹا اور غمی خوشی ایک ہی تصور کی جاتی تھی۔ لیکن اس کی یہ

بربادی تقسیم کی وجہ سے عمل میں آئی جس کی وجہ ہر ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ۔اور انہوں نے صرف اس بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس عالی شان عمارات کو آگ لگا کر اس تاریخی ورثہ کو مٹانے کی بھر پور کوشش کی۔ جلنے کے بعد ملبوسات کے گودام ،کتابوں کے جلے ہوئے اوراق آسمان پر ایسے سیاہ پرندوں کی بے بسی سے اُڑنے اور شہر لاہور کی چھتوں پر دھیرے دھیرے بیٹھتے جیسے ان کے پر کٹ چکے ہوں۔ آسمان کی مسلسل سرخی میں یہ جلی ہوئی راکھ اُڑتی پھرتی دکھائی دے رہی تھی۔وہ شاہ عالمی کہ جس کا ذکر لوگ حوالے دے دے کر کیا کرتے تھے۔ آج اس کی حالت کھنڈرات سے کم نہ تھی اب لوگ اگر آتے بھی تھے تو صرف اور صرف اس کے کھنڈرات کو ہی دیکھنے آتے تھے۔شاہ عالمی کے جلنے اور تباہ و برباد ہوجانے کے بعد لوگوں میں اُداسی اور رنج وغم دیکھنے کو ملا ۔ جلنے کے دوران کچھ ایسی عمارات بھی تھیں جسے آگ نے چھوا تک نہیں تھا جس کے بارے میں مصنف لکھتا ہے کہ:

> ''شاہ عالمی کو جن جیالوں نے جلایا تھا وہ اس معجزے پر سر دُھنتے تھے کہ بازار کے عین درمیان میں لال مسجد کو آگ نے چھوا تک نہیں تھا۔اور یہ حقیقت تھی کہ آگ اس مسجد کی دیواروں کو چھو کر پیچھے ہوگئی تھی۔''(۱۱)

اس کے جلنے کے بعد جو غصہ اور اُداسی لوگوں میں دیکھی گئی اُس کی وجہ سے اس تاریخی مقام کی بربادی کہ جہاں یہ مقامات آگ کی لپیٹ میں آئے تو ضرور لیکن انہیں آگ نے نہ چھوا اور اس کے قریب آکر واپسی کی راہ لی۔ یہاں رنج وغم یہ نہ تھا کہ عمارات جل گئیں بلکہ اس کا تو شائد غصہ اتنا نہ تھا لیکن وہاں پر موجود مذہبی عبادت گاہیں جو کہ شاہ عالمی میں اپنی تاریخی وثقافتی ورثہ کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی اور انتہائی اہمیت کی حامل تھیں۔ایک طرف انسانوں کا کسی علاقے کو برباد کرنے کا عزم اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اپنے گھر کی حفاظت ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ بیانیہ میں جہاں ان عالی شان عمارات کی تباہی کا ذکر ملتا ہے وہاں اس اللہ کے گھر کی معجزانہ طور پر بچنے کی خبر بھی بیانیہ کا انتہائی اہم حصہ ہے۔اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ اللہ اپنے گھر کی حفاظت خود فرماتے ہیں اور اس بات کا ثبوت زیر بحث بیانیہ میں لال مسجد جو کہ شاہ عالمی میں قائم تھی فسادات کے دوران محفوظ رہی جو کہ واقعی معجزہ سے کم نہیں۔

اس بیانیہ کو اگر بغور پڑھا جائے تو کہیں کہیں اس میں بے ترتیبی دیکھنے کو ملے گی کیونکہ بقول معین

الدین جینا بڑے ترتیب اور تسلسل کا ہونا کسی بھی بیانیہ کے لئے لازم ہے لیکن بقول گوپی چند نارنگ بیانیہ کے لئے وقت کی قید یعنی ماضی سے اس کا تعلق ہونا لازمی ہے ۔ اس بیانیہ کو دیکھنے کے بعد گوپی چندنارنگ کی تعریف کے ضمن میں زیر بحث بیانیہ کسی قدر درست اور کسی حد تک بیانیوں میں اس کا شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں تاریخ کہ جس میں ماضی کا ذکر کسی حد تک ملتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے بیانیہ کا تعلق ماضی کے ساتھ مسلسل جڑا ہوا ہے جو تاریخی واقعات کو تسلسل کے ساتھ افسانوی انداز میں بیان کرتا ہے۔شاہ عالمی کی وہ عمارات ،رہائش گاہیں ،حویلیاں،عبادت گاہیں اور دکانیں جلنے کے بعد ایک شکست خوردہ قوم کی روداد پیش کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔کبھی اس مقام سے کوئی چوڑی نکل آتی اور کبھی کوئی جلی ہوئی بندیا یا پھر کبھی کوئی جلا ہوا ہاتھ نکل آتا۔

تقسیم ہند سے قبل جن علاقوں میں ہندوؤں کی واضح اکثریت تھی ان میں اندرون شاہ عالمی ،کرشن نگر،نسبت روڈ،قلعہ گوجر سنگھ، ماڈل ٹاؤن ،شام نگر ،چوک سوتر منڈی ،رام گلی اور پرانی انارکلی شامل تھے جبکہ نکلسن روڈ اور بیڈن روڈ پر سکھوں اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی تھی۔لاہور کی ہندو آبادی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ لاہور پاکستان میں شامل کر لیا جائے گا۔جب اعلان کیا گیا اور لاہور پاکستان کے حصے میں آیا تو ہندوؤں کے اوسان خطا ہو گئے، ان کے رنگ اڑ گئے جبکہ بعد میں ایک روایت یہ بھی سنی گئی کہ ہندوؤں نے یہ کوشش کی کہ لاہور کو برلن کی طرح دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔یہ خیال خام ثابت ہوا ۔اصل میں صورتحال اس وقت اپنے نقطہ عروج پر پہنچی جب شاہ عالمی کے علاقے کو آگ لگا دی گئی ۔آبادی یہاں کی بہت گھنی تھی اور گلیاں اس قدر تنگ تھیں کہ بیک وقت دو افراد کا گزرنا بھی مشکل تھا۔بہت سے مقامات پر تو دوپہر کو سورج کی روشنی بھی نہ نظر آتی۔اگست یا ستمبر کے دنوں میں یہاں آگ لگنے کے واقعات ہونے لگے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عالمی کی آگ بہت بھیانک تھی۔ رات کے وقت شہر سے پانچ میل دور ماڈل ٹاؤن میں بھی اس کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔معلوم ہوتا تھا جیسے سارا لاہور جل رہا ہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ سارا شاہ عالمی ملبے کا ڈھیر بن گیا۔ملبہ ہٹانے کے بعد یہ علاقہ خاصا کشادہ شکل اختیار کر گیا۔

قیام پاکستان کے بعد شاہ عالمی دروازے کو گرا دیا گیا ،اندرون شاہ عالمی دروازہ ملبہ صاف کر کے قدرے کھلی اور بڑی عمارات بنا دی گئیں جو آج غیر ملکی اشیا کی سب سے بڑی منڈی کہلاتی ہے۔قیام پاکستان سے قبل شاہ عالمی دروازے کے اندر ہندو اکثریت کی آبادی تھی اور بازار اتنے تنگ تھے کہ وہاں

سے پیدل گزرنا مشکل تھا۔ بیانیہ کی اصل کہانی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس دور میں بھی یہ علاقہ تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاہ عالمی کبھی شہر قدیم کے دیگر عجوبوں کی طرح فن و ثقافت کا گہوارہ تھا۔ یہاں کے گلی کوچوں میں چہل پہل اور جھروکوں سے قہقہوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ اس علاقے نے تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات کے زخم اپنے سینے پر کھائے اور آج یہاں کی بلند و بالا عمارتوں ،ٹریفک کے دھوئیں ،شور اور دن رات جاری تجارتی سرگرمیوں کے باوجود لاہور کی وہ پرانی ثقافت کہیں دبی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جہاں آزادی کی خوشی اور مسرت انسان کو دلی سکون اور سکھ چین فراہم کرتی ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ انہیں آزادی کے فوراً بعد کچھ جسمانی، مالی اور معاشی مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہ بیانیہ بھی جہاں افسانوی قصہ یا پھر کہانی کے انداز میں تقسیم کے بعد پاکستان میں مہاجرین کی حالت ایک تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان کرتا ہے وہاں قاری اس کو با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بیانیہ باقی بیانیوں کی نسبت زیادہ آسان اور سہل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس بیانیہ کے تمام تر واقعات جو کہ تاریخ کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اپنا مقصد اور مدعا با آسانی قاری تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ مصنف ایک جگہ ناول کے بیانیہ میں رقمطراز ہے کہ:

> ''اُن پناہ گیروں کی شکلیں ایسی تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا اداکار اُن جیسی شکل بنانے پر قادر نہیں تھا۔۔۔ ہزاروں برسوں سے کسی گھر میں رہنا۔ آس پاس کے ویرانوں کو قبروں سے آباد کرنا۔۔۔ پھر اُن گھروں کو ایک تنکا اُٹھائے بغیر چھوڑنا۔''(۱۲)

ہمیشہ مہاجرین خواہ کسی بھی دور میں اور کسی بھی مذہب ،ملک یا ریاست سے ان کا تعلق رہا ہو انہیں ہجرت کے دوران مشکلات و مصائب سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ یہ بیانیہ بھی کچھ اسی طرح کے مصائب و الام سے بھرپور ہجرت کی کہانی کو بیان کر رہا ہے۔ بیانیہ ہجرت کے دوران اور ہجرت کے بعد کے حالات کو بہت ہی باریک بینی سے قاری کے لئے تجسس اور آگے کیا ہونے والا ہے کی کیفیت طاری کرنے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتا ہے ہجرت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ اس دور کے ہجرت سے جڑے ہوئے

تمام کے تمام واقعات باقاعدہ ترتیب کے ساتھ اور ایک تسلسل کے ساتھ پروئے ہوئے دکھائے گئے ہیں یہ ایک انتہائی متاثر کن بیانیہ ہے۔ان افراد کو مہاجر کہا جائے یا پھر پناہ گیر یا پناہ گزین کہا جائے ہر صورت میں یہ لوگ اس وقت ضرورت مند تھے انکی مدد انصار کی ذمہ داری ہے۔پناہ گیروں کی شکلیں مصائب و الام اور حالات اور پھر ایسے دلخراش حالات کہ جس میں انہیں اپنے محلات ،حویلیوں کو چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑی اور بے سرو سامانی کے عالم میں پاکستان کی خاطر ہجرت کو ترجیح دی حالانکہ ان پناہ گیروں نے اپنی اولادوں کو نیزوں پر اٹھائے جانے والے مناظر کو بھی اپنی انکھوں اور دلوں میں محفوظ کرلیا لیکن کچھ نہ کر سکے اور وہ مناظر بھی دیکھے جن میں انکی اولادوں کو کرپانوں سے کاٹا گیا لیکن انکی صرف اور صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آزاد ملک میں آکر بسیں اور اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔یہاں انہیں وہ ماحول ملے کہ جس کے لئے انہوں نے قربانیاں دیں۔پاکستان خاص کر پنجاب میں آنے والے پناہ گیر اور پاکستان سے جانے والے پناہ گیر جو کہ ہندوستان ہجرت کرنا چاہتے تھے کی تمام ہجرت کی مشکلات اور مصائب کو بیانیہ میں افسانوی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔مصنف کے بقول جانے والے اور پاکستان آنے والے پناہ گیروں نے ایک دوسرے کی جگہ لینی تھی اس لئے دونوں طرف کی حکومتوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن خاص کر پاکستان آنے والے مہاجرین کو زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ پاکستان کے وسائل کے مقابلے میں مسائل زیادہ تھے اس کے برعکس ہندوستان جانے والے مہاجرین کو اتنی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ ہندوستان کے وسائل زیادہ تھے۔پاکستان میں آنے والے مہاجرین کی حالت ایسی تھی کہ ایک اداکار اور فقیر کی سی شکلوں میں دکھائی دے رہے تھے۔اس تاریخی بیانیہ میں مصنف مہاجرین اور لاہور کے رہنے والے لوگوں کے صبر اور برداشت کو تاریخ کے زاویے میں تولنا اور جو کہ واقعی مشکل اور جان کن عمل تھا۔پناہ گیروں کے لئے پاکستان میں رہنے کے حوالے سے مصنف نے اپنے افسانوی انداز بیان میں جن اقدامات کا ذکر کیا ہے وہ ناول کے بیانیہ میں کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''یہ پناہ گیر ہر صبح گوالمنڈی میں واقع چوہدری اللہ داد خان کے گھر کی بالکونی تلے جمع ہوجاتے اور اُوپر دیکھنے لگتے۔ان تک خبر پہنچی تھی کہ اللہ داد کے پاس کرشنا گلی،گوردارجن نگر اور گاندھی سکوائر میں ہندوؤں اور سکھوں کے مقفل مکانوں کی چابیاں موجود ہیں۔''(۱۳)

کسی جگہ تو مصنف نے بیانیہ میں ہندوؤں کو مظلوم گردانے کی کوشش کی ہے تو کسی جگہ مسلمانوں کو مظلوم دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ اس بیانیہ میں ہندوؤں کو ظالم پاکستان کے مسلمانوں کو مظلوم بنایا گیا ہے۔یعنی مصنف گزرے ہوئے بیانیہ کے برعکس ایک ایسا منظر انکھوں کے سامنے لاتا ہے کہ جس سے یہ تاریخی واقعہ حقیقت بن کر سامنے آتا ہے جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی ہوایسا معلوم ہوتا ہے ۔اگر چہ مصنف کے ہاں بیانیوں کا انداز بیان کہانیوں کی ترتیب وتزئین تقریباًایک جیسی ہی ہے مگر پھر بھی ان کے بیانیوں میں کئی مقامات پر تضاد کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ایک مقام پر مسلمان ان کے مکان کو جلاتے ہیں تو دوسری طرف مسلمانوں کو کرپانوں میں پروتے ہوئے دکھایا گیا ہے ایک طرف ہندوؤں کی ٹرین کا مونکی ریلوے سٹیشن پر خون سے لت پت دکھائی گئی ہے تو دوسری طرف مسلمان خواتین کے سروں کو ننگا دکھایا گیا ہے۔ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و زیادتی کی وجہ سے یہاں اس بیانیہ میں وہ مہاجرین کہ جو ہجرت کرکے ہندوستان سے آئے تھے ان کے لئے لاہور میں گوالمنڈی کے مقام پر اللہ داد نامی شخص کے ذریعے ہندوؤں اور سکھوں کے مقفل گھروں کو ان کے حوالے کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ہندوؤں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ واپس دوبارہ اجائیں گے یہاں سب کچھ ان کی سوچ اور گمان کے بالکل برعکس ہوگیا کیونکہ ہندوؤں نے باہر جانے والے راستے لوہے سے بنے ہوئے مضبوط دروازوں سے بند کر دیتے تھے ۔وہ سمجھتے تھے کہ لاہور فسادات کے بعد ہندوستان کے پاس چلا جائے گا اور اس طرح ان کے گھر انہیں واپس مل جائیں گے لیکن جب سب کچھ ان کی سوچ کے بر خلاف ہوگیا تو وہ بہت زیادہ پچھتائے لیکن اب ان کے ہاتھ سے سب کچھ نکل چکا تھا۔بیانیہ میں ان کے تقسیم سے قبل کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ اس دوران اپنے اڑوس پڑوس میں موجود مسلم آبادی پر وقتاً فوقتاً فائرنگ بھی کیا کرتے تھے جن سے مسلمان خاصے تنگ تھے لیکن کر کچھ نہیں سکتے تھے اب یہ گلیاں کہاں محفوظ رہتیں۔مصنف ان گلیوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

> ''کرشنا گلی کا پورا علاقہ اب ویران تھا۔بہت کم لوگ اس کے اندر جاتے تھے۔ہر دروازے پر تالا دکھائی دیتا۔اللہ داد اور پناہ گیر کرشنا گلی کے اندر جب پہلا قدم رکھتے تو سب کے سب چُپ ہو جاتے۔۔۔اُنہیں ہر دم یہی خدشہ رہتا کہ آہنی دروازے اُن کے پیچھے بند ہو جائیں گے یا وہ آجائیں گے اور کہیں

گے کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو لیکن ہتھوڑی کی پہلی ضرب سے پہلے تالے کا منہ
کھلنے تک یہ سہم رہتا اور پھر اُن سب کو اپنے گھر یاد آجاتے اور پھر اُن گھروں کو
دیکھنے لگتے جو اُن کے ہو سکتے تھے۔''(۱۴)

ہندو تو اس طرف واپس نہ آسکے مگر وہ لوگ کہ جنہوں نے مصائب و الام برداشت کئے وہ ضرور یہاں ان ہندو اکثریتی علاقوں میں پناہ گیر بن کر آئے۔فسادات کے بعد اب یہ گلیاں ویران ہو چکی تھیں کیونکہ ہندوؤں نے اپنے گھروں اور حویلیوں کو تالے لگائے تھے مگر آنے والے مہاجرین کے رہائش کا بندوبست کرنے کے لئے مقفل شدہ گھروں کے تالے توڑنا ناگزیر ہو چکا تھا۔مگر جن پناہ گیروں کو وہ گھر تالے توڑنے کے بعد دے دیئے جاتے ان میں سے اکثر یہ بات سوچتے کہہ کہیں ہندو پھر واپس نہ آجائیں اور یہ نہ کہیں کہ تم لوگ ہمارے گھروں میں کیسے رہ رہے ہو۔کئی لوگ تو ان گھروں میں سازو سامان دیکھ کر خوفزدہ ہوجاتے کہ اتنا اعلیٰ اور شاندار گھر کا سامان اور حویلی کس طرح انہیں ملی۔یعنی یہ لوگ ان گھروں میں ایسے جاتے جیسے بن بلائے مہمان ہوتے ہیں جبکہ ان پناہ گیروں میں سے کچھ تو ایسے بھی تھے کہ جو ان گھروں میں فاتحانہ انداز میں سینے تھان کراندر جاتے کہ جیسے ان کے اپنے گھر ہوں۔ایک اور مقام پر مصنف لکھتا ہے کہ:

''پہلی بار جب وہ ایک ایسے مکان کے اندر گیا تو ٹھنک گیا۔باورچی خانے کے
کونے میں چند ادھ جلی لکڑیاں تھیں۔چولہے پر ایک ہانڈی دھری تھی۔گھڑوں
میں پانی تھا۔ایک کونے میں کوڑے کرکٹ کی ایک چھوٹی سی ڈھیری تھی اور پاس
ہی ایک گنجا سا چھاڑو تھا۔

جیسے ہزاروں برس پُرانا کسی فرعوں کا ایک زیر زمین مقبرہ دریافت ہوتا
ہے۔آسائشوں کے تمام سامان۔۔۔۔وہی ہوا جس میں اُنہوں نے سانس لیے
تھے۔چراغ کی لو بجھاتے ہوئے دیوار کی کالک پر اُنگلیوں کے نشان۔۔۔اُن
کے جو ابھی ابھی وہاں سے نکلے تھے۔''(۱۵)

بیانیہ کے آغاز سے لے کر اختتام تک اس کے ترتیب اور تنظیم میں کسی قسم کا فرق نہیں دیکھا

جاسکتا۔اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بیانیہ باقی بیانیوں کی نسبت قدرے زیادہ اسلوبی اور ترتیبی نوعیت کا ہے کہ جس کے کردار ہوں یا پھر اس کے واقعات ہوں ہر ہر واقعہ دوسرے واقعے اور ہر کردار دوسرے کردار کے ساتھ مربوط اور متوازن خوبیوں کا حامل دکھائی دیتا ہے۔یعنی بقول گوپی چند نارنگ بیانیہ تو فکشن کی زینت ہے اور کہانی بمعنی Story Line کے جو بیانیہ میں جاری رہتی ہے۔ یا جس سے پلاٹ بنا جاتا ہے یا جو کرداروں کے واقعات یا مکالموں و مناظر کی تشکیل کرتا ہے۔زیر بحث بیانیہ بھی کم و بیش انہی خوبیوں کا مرقعہ معلوم ہوتی ہے کہ جو فکشن میں تو بیان ہوا ہی ہے ۔اور ساتھ ہی ساتھ اس کے کردار اور کہانی کی نوعیت اسی طرح بیانیہ میں جاری و ساری دکھائی دیتی ہے اگر چہ مکالمہ کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے یہ کہ سکتے ہیں کہ مکالموں کی ضرورت ہی محسوس نہ کی گئی کیونکہ ان کے بغیر بھی بیانیہ کا مقصد سمجھ میں آجاتا ہے جیسا کہ اس بیانیہ کے اسلوب اور اس کے سہل ہونے سے ظاہر ہے۔

بیانیہ کی کہانی ان پناہ گیروں کی دلیری کو بھی بیان کرتی ہے کہ اب یہ پناہ گیر اس حد تک دلیر ہو چکے ہیں کہ انہیں اب کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ان کے دل میں کسی قسم کا خوف باقی رہا ہے۔بیانیہ میں ایک ایسے غریب خاندان کا ذکر آتا ہے کہ جو اپنی بیٹیوں کے ساتھ ایک مکان میں گھس جاتا ہے اور شام کو انکی بیٹیوں نے انتہائی زرک برک کپڑے زیب تن رکھے تھے اور خوب لپ اسٹک لگا رکھی تھی اور بابا جی ایک شان دار حقہ پی رہے تھے اور مسلسل کھانس رہے تھے۔یہاں اس خاندان کی مثال اس انداز میں دی گئی ہے کہ غربت کے ستائے ہوئے اس خاندان نے ایک عالی شان مکان پر قبضہ کیا ہوا تھا کہ جہاں پر انہیں وہ تمام سہولیات میسر تھیں جو کسی بھی اعلیٰ اور امیر خاندان کے گھر میں حاصل ہوتی ہیں اور جب ان سے کھانسی کے بارے میں پوچھا گیا تو بابا جی نے کہا کہ یہ کھانسی اس لئے آرہی ہے کہ تمباکو کو پینے کی عادت نہیں ہے لیکن گھر کے دو کمرے تمباکو سے بھرے ہوئے نکلے ہیں جس کی وجہ سے پی رہا ہوں پھر جا کر کہیں ختم ہوگا۔یہاں ان پر وہ محاورہ صادق آتا ہے کہ ''مال مفت دل بے رحم'' کیونکہ تمباکو ان کے پیسوں سے نہیں آیا تھا اور کیا انہیں ختم کرنا اور اپنے آپ کو بیماری میں مبتلا کرنا لازم ہے یعنی اس کو خرچ کہیں یا کچھ اور لیکن بات اس پر آکر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس سے کہیں آگے جاتی ہے۔ پھر یکدم ان کی بیٹیوں کے کپڑے اور بناؤ سنگھار میں تبدیلی یہ سب پر آسائش زندگی کی مثالیں ہیں۔ان میں سے کچھ تو ایسے پناہ گیر تھے کہ جو ان گھروں میں مجرموں کی طرح رہنے پر مجبور تھے اور کسی بھی گھر کی شے کو ہاتھ نہ

لگاتے تھے کیونکہ انہیں پھر واپس جانے کا یقین تھا کہ ہم بھی ایسے ہی بھرے گھر چھوڑ آئے ہیں اور اب وہ بے یقینی کی وجہ سے دکھی تھے۔اب ایک بھی گھر مقفل نہ رہا سب گھر آباد ہو چکے تھے۔تقسیم ہند کے بعد کافی وقت گزر چکا تھا۔اس طرح پناہ گیراب پناہ گیر نہ رہے کیونکہ انہیں گھر مل گئے تھے اور یہ مکمل سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔اگر چہ باقی مسائل توجوں کے توں تھے لیکن اصل سر پر چھت والا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ان کے علاوہ کچھ لوگ جو بعد میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان کی قسمت میں فٹ پاتھ اور میدان ہی لکھے تھے۔اس وقت ان کی مشکلات میں اضافہ ہوگیا جب سردی کا موسم آیا۔ اللہ داد جو کہ انتہائی مخلص اور ایماندار شخص تھا اس نے ان بے سروسامانی کے عالم میں رہنے والوں کے لئے کمبل اور چادروں اور رضائیوں کے لئے مختلف گھروں کا رُخ کیا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کہ مہاجرین کے لئے جو کھلے آسمان تلے فٹ پاتھوں اور میدانوں میں پڑے ہیں سامان دیا جائے۔اللہ داد کی تمام تر توانائی ان بے گھر پناہ گیروں کی امداد کے لئے صرف ہوتی تھی۔اللہ داد کے بارے میں مصنف لکھتا ہے کہ:

> ''چوہدری اللہ داد ایک سیلف میڈ شخص تھا۔اور اس کے باوجود وہ دھیما اور نرم طبیعت کا تھا۔۔۔وہ دراز قد ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تھا اور اُس کے جاننے والے کھانس کر اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے اور پھر سلام کرتے۔۔۔ورنہ وہ پاس سے گزر جاتے اس کی نرم دلی اُس کی بیوی کے لئے ایک آزار تھی۔اگر اُس نے سٹیشن کے قریب فٹ پاتھ پر کسی بوڑھے کو لیٹا ہوا دیکھ لیا ہے تو وہ اذیت میں مبتلا ہو جائے گا۔کیا اس بوڑھے نے کھایا ہے؟ پتہ نہیں رات گزارنے کے لئے اس کے پاس کوئی گرم کپڑا ہے یا نہیں؟ کہیں وہ بیمار تو نہیں۔وہ بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا اور اس کی بیوی جان جاتی کہ آج پھر بوڑھا ہے،کوئی بچہ ہے کوئی معذور ہے جو اسے سونے نہیں دیتا۔'' (۱۶)

تقسیم ہند کے بعد جہاں مہاجرین کی مشکلات کو خاص ترتیب اور موقع کی مناسبت سے بیان کیا گیا ساتھ ہی ساتھ ان مشکلات کے حل کے لئے بھی ایک خاص کردار اللہ داد کے نام سے متعارف کرایا ہے۔یہ کردار پورے بیانیہ میں حاوی دکھائی دیتا ہے اور حاوی کیوں نہ ہو کہ جس کی بدولت پناہ گیروں کو سر ڈھانپنے کے لئے گھر نصیب ہوئے۔وہ کام جو حکومت وقت کے کرنے کا تھا وہ اللہ داد نے تن تنہا انتہائی

پرخلوص نیت کے ساتھ اپنے دلی سکون کی خاطر کر ڈالا۔ بیانیہ ان کی خوبیوں پر سے پردہ چاک کرتا ہے اور مزید آگے بڑھ کر اللہ داد کی اُس خوبی کا ذکر کرتا ہے کہ جسے مدد کئے بغیر نیند تک نہ آتی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو چوہدری اللہ داد کی شخصیت اس بیانیہ میں ایک فرشتے کی مانند ہے جس کا کام ان کی خدمت اور ان کے زخموں پر مرہم کی مانند ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعے سے بنتا ہے اور معاشرہ اگر مجموعی طور پر مخلص ہوگا تو یقیناً اس کے لوگ مخلص ہی ہونگے لیکن جہاں معاشرہ میں خودغرضی اور دیگر خرافات عام ہونگی پھر حالات خراب ہی ہونگے۔ یہاں دوران ہجرت نفسانفسی کا عالم تھا ہرایک اپنی ذات میں مگن دکھائی دیتا تھا لیکن ان کی شخصیت ایسی تھی کہ مہاجرین ان کو اپنا سب کچھ مانتے تھے۔ یہ سب اسی لئے ہوا کہ اللہ داد دل کا صاف اور نیت کا کھرا شخص تھا جو ہر وقت دوسروں کی امداد کرتا رہتا۔ حالانکہ بدامنی کا دور دورہ تھا یہاں تک کہ کامونکی سٹیشن پر مُردوں کے کپڑے اور زیورات کو بھی لوٹنے سے پرہیز نہ کیا گیا جو کہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ جس کا کوئی بھی مذہب اجازت نہیں دیتا۔ بیانیہ جہاں تک معنی خیز انکشافات بیان کرتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی کشمکش کے مناظر بھی دکھاتا ہے جو تاریخی لحاظ سے قاری کی دلچسپی اور ناول کو مزید دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ زیر بحث بیانیہ دیگر بیانیوں سے قدرے مختلف لیکن جہاں دس چیزیں مختلف ہوں وہاں کوئی ایک ادھی شے مشترک بھی ہے۔ یعنی ان میں مکالمہ نگاری سے نہ ہونے کے برابر کام لیا گیا ہے۔ ''راکھ'' کے اکثر بیانیے تقریباً مکالموں سے خالی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سارے کے سارے بیانیے اپنی اپنی فنی اور تکنیکی خوبیوں کے ساتھ بے مثال ہیں۔ ایک اور جگہ ناول میں مصنف ان مہاجرین کے ساتھ لوگوں کے رویوں اور افواہوں کا ذکر کرتا ہے کہ:

> ''نہرو کو لاہور کا بڑا غم ہے اور وہ سکھوں کی مدد سے اس پر حملہ کردے گا۔ پناہ گیر طرح طرح کی بیماریوں کو لے کر آئے ہیں اور طاعون والی ہے۔ چوہدری اللہ داد کا ذہن ان افواہوں کو قبول نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنے بال بچوں کی جانب دیکھتا تو بے چین سا محسوس کرتا۔ انہیں کسی محفوظ جگہ پر ہونا چاہیئے۔ اپنے گاؤں میں ۔۔ اپنے کچے آبائی مکان میں۔۔ ٹھیک ہے انہیں عادت نہیں ہے لیکن چند روز گزارہ کرلیں گے۔۔ یوں بھی اُن کی غیر موجودگی میں وہ دلجمعی سے رفیو جی اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا تھا۔'' (۱۷)

یعنی ایک طرف تو ہجرت کے مسائل اور دوسری طرف ہندو لیڈر نہرو کے ظلم و زیادتی کو یاد کرنا اور خوف میں مبتلا ہوجانا بھی ایک الگ مسئلہ ٹھہرا۔ بیانیہ ہر ایک تاریخی حوالے کے ساتھ واقعے کے ہر اُس پہلو سے عوامی فکر اور سوچ کو منظر پر لانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ جس سے اہم تاریخی واقعہ کو مزید مضبوط اور زمانے کے ساتھ مربوط کیا جائے جس کے نتیجے میں اصل حقائق قاری پر آشکار ہوسکیں۔اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ جس کی طرف مصنف نے توجہ دلائی ہے جو اُن افواہوں سے متعلق تھی کہ جس میں مہاجرین سے متعلق ان سے منسوب طاعون کی بیماری کا خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ مہاجرین کے ساتھ طاعون کی بیماری بھی پاکستان آئی ہے جس سے بڑے پیمانے پر نقصان کا اندیشہ ہے۔اسطرح لوگ مہاجرین سے دور رہنے اور اپنا بچاؤ کرنے پر مجبور دکھائی دیئے۔اس بیماری سے اپنے اور اپنے خاندان والوں کو بچانے والوں میں اللہ داد بھی تھا کہ جو اس بات پر یقین تو نہیں کرتا تھا لیکن ان کے دل میں بھی خدشات پیدا ہونے لگے اور اس نے بھی اپنے آبائی گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔دوسری جانب انتظامیہ اور عوامی سطح پر بدامنی اور خودغرضی کی وبا نے بھی پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کی مثال کامونکی کا ریلوے سٹیشن ہے۔

راکھ ناول کا ہر ایک بیانیہ اپنے بہترین اسلوب اور فنی خوبیوں کی وجہ سے ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار ہے جس سے مصنف کی ناول نگاری ابھر کر سامنے آتی ہے جس میں مصنف مختلف تاریخی واقعات کو ایک بیانیہ میں اس طرح پروتا ہے کہ قاری اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی طوالت اور اس میں موجود دیگر زبانوں کے استعمال ہونے والے الفاظ بھی اپنے معنی خود دے رہے ہوتے ہیں۔اسی طرح زیر بحث بیانیہ بھی کچھ اس نوعیت کا ہی ہے۔ یہ بیانیہ ایسا کہ جسے ایک ایسی کہانی کہ جو آغاز سے اختتام تک باقاعدہ ایک خاص ترتیب اور ایک خاص ردھم کے ساتھ آگے بڑھتی ہے جس سے وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعات بھی اپنی تاریخی اہمیت اور مقام و مرتبہ کے مطابق بیانیہ میں جہاں ان کی ضرورت ہو وہاں ایسے وارد ہوتے ہیں کہ جیسے موتیوں کا ایک لڑی میں پروئے جانا کہ جس میں کوئی بھی موتی قطار سے باہر دکھائی نہیں دیتا بلکہ ایک ہی سیدھ میں نظر آتے ہیں۔

زیرِنظر بیانیہ کا انداز اور اس کا اسلوب راکھ کے دیگر بیانیوں کی طرح افسانوی طرز کا ہے۔لہذا اس بیانیہ کو اگر دیکھا جائے تو یہ ان تمام اصولوں اور تمام کے تمام قواعد پر پورا اترتا ہے کہ جو ایک بیانیہ کی تعریف میں آتے ہیں۔جیسے گوپی چند نارنگ بیانیہ کو فکشن کی زینت اور جز قرار دیتے ہیں یا ژرار ژینت

کے بقول بیانیہ کتنا ہی خالص کیوں نہ دکھائی دے فیصلہ کرنے والے ذہن پر پرچھائی ضرور در آتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کے بقول بیانیہ ہمیشہ غیر خالص ہوتا ہے۔ جبکہ جیمز کے نزدیک کردار نگاری بیانیہ کی اصل روح اور کہانی یا واقعہ ہمیشہ کرداروں کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ تمام تعریفیں جو مختلف ادبی شخصیات نے بیانیہ کے لئے بیان کی ہیں سب کی سب زیرِنظر بیانیہ کے صحیح اور درست ہونے کا ثبوت ہیں۔اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ زیر بحث بیانیہ ناول نگار کی فنی خوبیوں اور ادبی فن ناول نگاری کی ایک بہترین اور اعلیٰ نمونہ ہے۔

اس بیانیہ میں دراصل ظہیر الدین بابر کے گھر کی بربادی اور بربادی سے قبل کی تاریخی تصویر مصنف اپنے افسانوی انداز میں پیش کر رہا ہے کہ جو اس دور میں اس گھر کے باسیوں اور اس گھر کے دیگر چاہنے والوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی بربادی کی وجوہات اور اسباب کا بھی مصنف ذکر کرتا ہے کہ آخر اس کی بربادی اور اس کے باسیوں پر ظلم کیوں روا رکھا گیا کیونکہ یہ صرف ایک گھر ہی نہیں تھا بلکہ اس کا ایک تاریخی مقام بھی تھا جس سے بہت سے افراد وابستہ تھے۔مصنف ایک جگہ اس گھر کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

> ''ڈیفنس کے اُس منشن نما گھر کے پورچ میں جسے باہر کی دیوار کے ساتھ سرسبز
> کٹاؤ والے پتوں کے ناریل درختوں کی وجہ سے ناریل والا گھر کہا جاتا تھا قدیم
> ماڈلز کی لیکن تقریباً شوروم کنڈیشن کی دو کاریں آگے پیچھے اینٹوں کے چبوتروں پر
> ایک عرصے سے Rest in peace کر رہی تھیں۔'' (۱۸)

تاریخی اور ماضی کی بے مثال شاہکار ہونے کی وجہ سے اس گھر کی ایک ایک چیز تاریخ کی ایک ایک نشانی کہی جا سکتی ہے۔لیکن ساتھ ہی ان اشیا کی سادگی اور نفاست کانعم البدل نہ تھا۔اگر کہا جائے تو مصنف نے اسے ایک عجوبہ کے طور پر بیان کیا ہے جو واقعی کسی عجوبہ سے کم نہ تھا۔اسی لئے ایک عام گھر اور اس گھر میں بہت فرق تھا اس لئے اس کو مرجع خلائق کہا گیا ہے۔اس گھر کی تاریخی حیثیت اور اہمیت پھر اس سے بھی بڑھ کر اس بیانیہ میں اس گھر کی بربادی کا ذکر جن دلخراش واقعات کے رونما ہونے سے کرتا ہے اس سے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔بعض ناول نگار قدرتی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں کیونکہ ان کی تحریریں دیگر لکھنے والوں کے مقابلے میں بہت زیادہ جداگانہ اور منفرد اور آفاقی نوعیت کی ہوتی

ہیں۔ جسے ہر ایک قاری جتنی بار پڑھتا ہے وہ اس کی تاثیر سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔تاریخی واقعہ ایک ہی ہوتا ہے ایک لکھنے والا جب اس واقعہ کو اپنے بیانیہ میں بیان کرتا ہے تو اس کی نوعیت اور اس کا اسلوب ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے لطف اندوز ہونے اور اس کی تاریخی اہمیت کو سمجھ لیتے ہیں۔مگر بعض ناول نگار اسی تاریخی واقعہ کو جب لکھتے ہیں تو ان کے بیان کرنے سے قاری کو اس میں دلچسپی کا مواد فراہم کرنے کی بجائے اکتاہٹ اور بے چینی پیدا کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ناول نگار نہ تو بہترین ناول اور بیانیہ لکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے ان بیانیوں کو یا ان کی کہانیوں کو انجام تک یا اختتامیہ تک بہترین اور واضح مقصد بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔انہی وجوہات کی بناء پر ان کے ناول اکثر اسی طرح دکانوں میں پڑے رہتے ہیں۔یا اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک مختصر ناول بعض اوقات قاری کے لئے دلچسپی سے خالی دکھائی دیتا ہے۔لیکن بعض اوقات ایک طویل ناول قاری کے لئے نہ تو اکتاہٹ اور نہ ہی تنگی کا باعث بنتا ہے بلکہ قاری اس کو مزے لے لے کر پڑھتا ہے جو کہ ایک اچھے ناول کی پہچان ہوتا ہے۔''راکھ'' میں ایک جگہ اس مرجع خلائق گھر کے بارے میں مصنف رقمطراز ہے کہ:

''صوفوں کے پہلو میں تپائی پر ایک بھاری ٹی کوزی کے نیچے نُوری نا کی جائے
دانی کرمی سے پسینے میں نہائی ہوئی لگتی تھی۔'' (۱۹)

ہمیں اگرچہ وہ گھر دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر مصنف کے بیانیہ میں ظہیرالدین بابر کے گھر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ بیانیہ کے انداز اور اسلوب کے عین مطابق ہے۔کیونکہ جتنی توانائی مصنف نے اس گھر کی تعریف میں خرچ کی ہے اس سے کئی گناہ بڑھ کر اس گھر کی حالت سمجھ میں آتی ہے کیونکہ جہاں بیانیہ میں مصنف نے گھر کے سامان کو بیان کیا ہے کہ جیسے وہ گھر اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے یا پھر ہم اس زمانے میں موجود ہیں اور ان چیزوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔بیانیہ نہ صرف گھر بلکہ اس گھر کے باسیوں کے حالات کے بارے میں بھی وہ منظر سامنے لاتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جیسے یہ حال ہی کا واقعہ ہو اور ماضی میں لے جا کر بیان کیا جا رہا ہو۔ایک ایسا کردار جو کہ بیانیہ کا خاص اور اہم کردار تصور کیا جا سکتا ہے اگر چہ یہاں گفتگو کرداروں کے بجائے بیانیہ کے افسانوی اسلوب اور اس کی تاریخی حقیقت کو جاننے کے بارے میں کی جا رہی ہے لیکن اس کا ذکر کیئے بغیر بیانیہ کی کہانی اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ظہیر الدین بابر کہ اہلیہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ اگر چہ یہ مخبوط الحواس تو نہ تھیں لیکن بھلکڑ ضرور تھیں یعنی انکی

یاداشت اس بڑھاپے میں کمزور ہو چکی تھی جیسے کہ عموماً بڑھاپے میں یہ حالت ہو جاتی ہے جیسے کوئی پاگل اور کوئی دیوانہ۔ جبکہ کوئی اسے مخبوط االحواس کہنے سے گریز نہیں کرتا۔ مصنف کی اس باریک بینی سے اس تاریخی گھر کے افراد کو یاد کرنا اور انکی اتنی باریک بینی سے مشاہدات کو سامنے لانا کہ جس کو قاری باآسانی سمجھ لیتا ہے اور ناول نگار کو اس بیانیہ کے ضمن میں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہاں تک کہ اس کی نیند اور آرام کو جوکہ کسی بھی انسان کے لئے زندگی برقرار رکھنے یا اسے پرسکون بنانے کے لئے لازمی ہوتی ہے کا ذکر بھی اس بیانیہ کی کہانی میں شامل ہے۔ بلکہ مصنف صرف اس بات پر اکتفا نہیں کرتا اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید یہ کہ بیگم بابر جیسا کہ اس کی نیند چند سیکنڈ کی ہوا کرتی تھی یہ سمجھئے کہ نہ وہ نیند میں ہوتی تھیں اور نہ ہی بیداری میں اور یہی اس کی زندگی کا معمول تھا۔

اس قسم کے باسیوں کا گھر کیوں کر مرجع خلائق نہ ہو کیونکہ جب ملک میں بدامنی کا دور دورہ تھا تو ان دنوں میں بھی اس گھر میں امن وسکون کا بسیرا تھا ان دنوں میں کوئی گھر بدامنی سے محفوظ نہ تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ملک کے مختلف حصوں سے نوجوان فوجی افسر یہاں آیا کرتے تھے اور بہت ہمدردیاں سمیٹ کر واپس جاتے تھے جوکہ اس دور میں ناممکن تھا۔ مصنف نے اس گھر کو اس دور میں لوگوں کے ہاں چھوٹی سی مغربی پاکستانی ریاست کا نام دیا تھا کہ جہاں آرام وسکون اور ہر دکھ کا علاج میسر آسکتا تھا۔ اس مرجع خلائق گھر پر جہاں خوشیوں کے شادیانے بجتے تھے کچھ ہی عرصہ بعد دیکھتے ہی دیکھتے یہ تمام خوشیاں غموں میں تبدیل ہوگئیں اور اس گھر نے بربادی کی طرف قدم رکھا۔ ''راکھ'' میں ایک جگہ مصنف ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ:

> ''آنٹی بابر ایک راکنگ چیئر میں۔۔۔اپنی پسندیدہ ساڑھی میں۔۔۔اور ان کے نتھنوں میں سے خراٹوں کی گہری آواز ۔۔۔آنکھوں پر دیوار شیشوں کی عینک ۔۔۔ساڑھی کی سفیدی پر کہیں کہیں سرخ دھبے تھے۔ وہ سوئی ہوئی تھیں ۔۔۔جس طرح جیسے آج ہیں۔
>
> ''عارفین کی چھاتیاں جن پر جئے بنگلہ پینٹ کیا گیا تھا۔ جئے کا ایک نقطہ اور بنگلہ کا دوسرا نقطہ پینٹ کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اُبھاروں کے اختتام پر نپل

یوں بھی سیاہ ہو رہے تھے۔اس کی باچھوں سے خون کی لکیریں گردن تک آتی تھیں اور جم جاتی تھیں۔عارفین کا سانس چلتا تھا، کیونکہ پرچم ہولے ہولے اوپر نیچے ہوتا تھا۔

''نازنین باتھ روم میں پڑی تھی۔ٹب کے اندر۔۔اور اسے بھی حب الوطنی کے جذبے سے سرشار کردیا گیا تھا ایک سبز پرچم لیکن چاند ستارے کو سرخ کرتا ہوا خون اس کا اپنا تھا۔'' (۲۰)

واقعہ کسی بھی دور کا ہو اور کسی بھی نوعیت کا ہو یا پھر کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو اس کا اتار چڑھاؤ اس میں غمی خوشی تمام کے تمام باریک سے باریک لمحے کو بھی قلم کی گرفت میں لانا ایک اچھے اور ناول نگار کے کام کی خوبی ہوتی ہے۔کیونکہ اس قسم کی ناول نگاری اور فنی مہارت کسی بھی بیانیہ کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔اس گھر کی بربادی کا واقعہ بیانیہ میں یکدم خوشی کا غمی میں بدل جانا اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہ ساری کہانی کے پیچھے کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی کہ جس کی وجہ سے اس مرجع خلائق گھر کو تباہی و بربادی نے گھیرا۔ وہ بات دراصل بنگالی علیحدگی پسندوں کے عزائم کے ساتھ جا کر جڑتی ہے۔اس کے تانے بانے بلکہ صاف صاف وہ لوگ اس میں ملوث تھے جو اپنی نشانیاں چھوڑ گئے۔ان سب فسادات کے پیچھے بنگالی شدت پسندوں اور بنگالی لسانی علیحدگی پسندوں کا ہاتھ تھا۔اس دور میں بنگالی علحدگی پسندوں نے وہ کام کئے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ کہ جن کے ذکر سے تاریخ بھی شرماتی ہے۔جہاں ظہیر الدین بابر کے لاش کے ٹکڑے کئے گئے وہاں ساتھ ہی ساتھ بیگم بابر کو بھی ابدی نیند سلا دیا گیا تھا جبکہ دونوں بیٹیوں کی لاشیں بھی نامناسب جگہوں پر پڑی تھیں۔اس طرح ظہیر الدین بابر کے گھر کی تباہی و بربادی سے بنگلہ دیش لسانی بنیادوں پر ایک نیا ملک دنیا کے نقشہ پر نمودار ہوا اور یہاں سے پاکستان دولخت ہوا۔ اس کی علیحدگی میں زیادہ کردار دونوں حصوں کے حکمرانوں اور ہمارے پڑوسی ملک بھارت کا تھا۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ کے مختلف بیانیے ہماری پچاس سالہ قومی تاریخ کے اہم واقعات سے عبارت ہیں۔ان میں تقسیم ہند سے قبل کی سماجی و سیاسی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے اور تقسیم کے وقت بدامنی قتل و غارت گری اور ہجرت کے واقعات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔آزادی کے حصول کے بعد

پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کی منظرکشی بھی کی گئی ہے۔اور جدید عہد کے پاکستان کے حالات و واقعات کو بھی مختلف بیانیوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔

راکـــــھ کے پلاٹ میں لاہور اور اس کی کچھ تاریخی عمارتیں بھی ہیں اور ان عمارتوں میں رہنے والے لوگوں کا طرز زندگی،روزمرہ کے مشاغل ،عادات واطوار اور سماجی رویوں کو بیانیوں میں پیش کیا گیا ہے۔ جیسے لکشمی منشن اور گوالمنڈی کے بارے میں مصنف نے ایک بیانیے میں لکھا ہے کہ ان دونوں مقامات پر دو الگ دنیائیں آباد تھیں۔ انہوں نے نوجوان جو تھڑوں پر بیٹھے رہتے ہیں اور جو کرکٹ کھیلتے ہیں ان کی عادات ونفسیات کو بیانیوں کے ذریعے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ لکشمی منشن میں رہائش پذیر لوگوں کے علیحدہ علیحدہ مذاہب کے باوجود ان میں باہمی اخوت اور محبت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مصنف کے بقول منشن دراصل ایک خاندان کی حیثیت رکھتا تھا۔اس میں مسلمان، ہندو، پارسی اور سکھ سبھی آباد تھے اور سب کے حقوق برابر تھے۔اس بیانیے میں ان لوگوں میں کوئی تفرقہ اور سماجی اونچ نیچ یا نفرت کا ماحول نہیں دکھایا گیا۔

راکـھ کے وہ بیانیے بہت اہم اور پراثر ہیں جو تقسیم کے وقت فسادات سے متعلق ہیں ان فسادات میں مسلمان اور ہندو دونوں اقوام کو زبردست جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔کامونکی ریلوے اسٹیشن پر قتل وغارت کا بیانیہ اس بھیانک صورتحال کو نمایاں کرتا ہے جس کا سامنا ہجرت کرنے والوں کو کرنا پڑا تھا۔ریلوے اسٹیشن جسے مسافروں کے لئے بنایا گیا تھا بقول مصنف کھلی قبروں کا نظارہ پیش کررہا تھا۔کیونکہ مسافروں کو اتنی بے دردی سے قتل کیا گیا تھا کہ کئی دنوں تک ان کی لاشیں پڑی رہنے کے باعث بدبودار ہو چکی تھیں۔وقت نے ایسی بھیانک صورتحال کو مزید موثر بنانے کی خاطر انسانوں کے ساتھ ساتھ کتوں کی حرکات وسکنات کو بھی اپنے بنایے کا حصہ بنایا ہے۔لاشوں پر گھومنے پھرنے والے ایک کتے کا حال یوں رقم کیا ہے کہ اس سڑاند میں سے اپنے وزن سے زیادہ انسانی لاش کو گھسیٹ کر ایک طرف لے جا رہا تھا۔

مصنف نے لاہور کے اہم مقامات اور وہاں کی زندگی کی تصویر کشی کرنے کی غرض سے جو بیانیے تحریر کیے ہیں وہ انکھوں کے سامنے لاہور کا قدیم نقشہ اُبھار دیتے ہیں ۔مغل شہنشاہ اورنگزیب کے بیٹے معظم شاہ سے منسوب شاہ عالمی دروازے کی تاریخی حیثیت بھی مصنف نے بیان کی ہے تو فسادات کے دوران

یہاں ہونے والی تباہ کاریوں کو بھی اپنے بیانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ ایسے بیانیے ماضی کے واقعات کو زندہ واقعات بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بیانیے کا ایک ایک کردار چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ایک ایک واقعہ انکھوں کے سامنے یوں پھیل جاتا ہے جیسے یہ ماضی کا واقعہ نہیں بلکہ حال میں جاری واقعہ ہے۔

شاہ عالمی میں آگ لگانے اور ہندوؤں کے مکانات اور دکانیں جلانے کے واقعات بیانیوں میں بڑے موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ایک بیانیے میں بتایا گیا ہے کہ ہندو شاہ عالمی دروازے کو بند کر کے محصور ہو چکے تھے۔ایک مجسٹریٹ نے چند جانبازوں کو زیر زمین گندے نالے کے ذریعے اندر پہنچایا اور انہوں نے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگادی۔ایسے بیانیے ایک متحرک فلم کی طرح محسوس ہوتے ہیں اور ان بیانیوں کی یہی خوبی راکھ کو ایک کامیاب ناول بناتی ہے۔تاریخی اعتبار سے راکھ مجموعی طور پر اپنے اندر وہ تمام خوبیاں سمیٹے ہوئے ہے جو ایک بہترین ناول کی ہوسکتی ہیں۔اسی وجہ سے ناول راکھ کے بیانیوں میں وہ دلکشی،رنگینی اور حقیقت پسندی جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو بہت ہی کم ناولوں کے بیانیوں میں پائی جاتی ہے۔ ناول نگاری کے میدان میں ناول کا اسلوب خواہ فنی لحاظ سے ہو یا پھر تکنیکی اعتبار سے ہو ناول کے ہیئت میں اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ناول کی ہیئت ناول کے بیانیوں کے کرداروں کی بدولت وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے ۔ یہ تبدیلی ناول کے بیانیوں میں وہ پختگی اور حقیقت پسندی کو رواج دیتی ہے جو کسی بھی اعلیٰ پائے کے ناول میں ہونی ضروری ہے۔واقعات کے درمیان بیانیوں کا ایک خاص قسم کے تسلسل کا وقوع پزیر ہونا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ان واقعات کا ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہونا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ جتنا زندگی اور موت کا تعلق ہوتا ہے۔ یہی اس ناول کی خاصیت ہے کہ اس کے تمام واقعات اپنے بیانیوں کے اعتبار سے خواہ بیانیے صرف بیان کی حد تک ہوں یا پھر افسانوی نوعیت کے ہوں انتہائی اعلیٰ اور نفیس انداز میں ان کے درمیان ایک تسلسل اور باہم جڑاؤ کا عنصر ہر لحاظ سے پایا جانا چاہئیے ۔ناول راکھ کا افسانوی انداز اسلوب ہر ہر بیانیے کو حقیقت پسندانہ انداز میں پروان چڑھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ناول راکھ کے بیانیے نہ صرف واقعات کی شدت اور اہمیت کو قاری کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں بلکہ یہ قاری کی توجہ کا مرکز ہیں۔ کیونکہ ناول راکھ کے واقعات میں ہر بیانیہ اپنا ایک علیحدہ مگر سابقہ بیانیہ کے ساتھ ربط میں رہتے ہوئے اپنا پورہ مقصد بیان کرتا ہے۔ ناول راکھ کی کہانی کا ہر ہر کردار گفتار کا متحمل دکھائی دیتا ہے جو اپنے اندر ایک خاص قسم کا جذبہ سموئے ہوئے ہے۔راکھ کے بیانیوں کا بغور مطالعہ کرنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ناول میں نہ تو غیر ضرری گفتگو کو بیانیہ

کا حصہ بنایا گیا ہے اور نہ ہی بیانیوں کے کرداروں میں کسی قسم کی غیر ضروری اور بے موقع عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ یہ ناول تاریخی لحاظ سے ایک قسم کا بیش بہا خزانہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ناول قاری کو زمانے کے پس و پیش منظر سے بھی آگاہی کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ ایک طرف اس کے بیانیے حالات کی نزاکت کو بیان کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھتے ہیں تو دوسری طرف واقعات کے وقوع پزیر ہونے والے حالات کا اس زمانے کے اعتبار سے کرداروں کے ذریعے وضاحت بیان کر رہے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ بانیوں کے واقعات اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس وقت لوگوں کی حالت کیسی تھی۔ ناول راکھ چونکہ اپنے زمانے کے اعتبار سے پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کا جذوی خاکہ بیان کرتا ہے لیکن یہ جذوی خاکہ جذوی ہونے کے اعتبار سے نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھا دیتا ہے۔ ناول راکھ اپنے نام کے اعتبار سے ایک ایسی قوم کا ذکر کرتا ہے کہ جو اپنی شکست و ریخت کو برداشت کرتی چلی آئی ہے اور نہ جانے آگے کتنے عرصے مزید برداشت کرے گی۔ جہاں تک یہ ناول قوموں کے عروج و زوال کا عکس پیش کرتی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ اس معاشرہ کے افراد کی مجموعی سوچ اور اس سوچ کے ضمن میں معاشرتی نظام کی عمومی حالت کا بھی جائزہ لیتا ہے۔اس لحاظ سے راکھ ماضی کو حال اور مستقبل کے سات ملاتا ہے جس سے یہ ناول موضوعی اعتبار سے حقیقت کے انتہائی قریب دکھائی دیتا ہے۔ ناول کے بیانیے جہاں ماضی حال کا ذکر کرتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ علاقائی تاریخی عمارات اور ان عمارات سے وابستہ افراد کے روز مرہ معمولات کو بھی اپنے بیانیوں کی زینت بنایا ہے۔ مصنف ان تاریخی عمارات کی اہمیت اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ناول کے بیانیوں میں حالات و واقعات کے تناظر میں ہندو مذھب کے پیروکاروں اور مسلمانوں کے آپس میں رہن سہن لین دین کو بھی انتہائی غیر جانبداری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ناول کے بیانیوں میں ہندو مسلم گھرانوں کے آپس کے تعلقات اور رنگ و نسل کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مقابلے میں یہ سرحدیں دور دور تک کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ان کے ہاں باہمی پیار و محبت کا رشتہ اتنا ہی مضبوط دکھایا گیا ہے کہ جہاں مذھب کا فرق ہی دکھائی نہیں دیتا۔ ناول میں اصل بیانیہ مسلمان خاندان کا ہندو اور سکھ خاندانوں کے ساتھ تعلقات قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم انتہائی پائیدار اور پر امن دکھائے گئے ہیں۔ناول فنی لحاظ سے ان تمام خرابیوں سے کوسوں دور دکھائی دیتا ہے۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے یہ ناول دیگر ناولوں کے مقابلے میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مستنصر حسین تارڑ، راکھ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء)، ص ۶۳

۲۔ ایضاً ص ۷۷

۳۔ ایضاً ص ۸۰

۴۔ ایضاً ص ۹۹

۵۔ ایضاً ص ۱۰۱

۶۔ ایضاً ص ۱۲۳

۷۔ ایضاً ص ۱۱۸

۸۔ ایضاً ص ۱۱۸

۹۔ ایضاً ص ۱۱۹

۱۰۔ ایضاً ص ۴۷

۱۱۔ ایضاً ص ۱۰۱

۱۲۔ ایضاً ص ۱۰۲

۱۳۔ ایضاً ص ۱۰۲

۱۴۔ ایضاً ص ۱۰۳

۱۵۔ ایضاً ص ۱۰۴

۱۶۔ ایضاً ص ۱۰۸

۱۷۔ ایضاً ص ۱۱۱

۱۸۔ ایضاً ص ۱۴۷

۱۹۔ ایضاً ص ۱۴۸

۲۰۔ ایضاً ص ۱۵۰

باب سوم
ناول نادار لوگ میں اہم افسانوی بیانیوں کا تجزیہ

ناول نادار لوگ میں اہم افسانوی بیانیوں کا تجزیہ

ایک عمدہ ناول تخلیق کار کے ذہنی وفکری ارتقاء کی باضابطہ تکمیل ہے اور اگر یہ فکر اپنی ابتداء سے پختہ ،روشن اور بھر پور ہو تو پڑھنے والوں پر سوچ کے کئی دروازے کھل جاتے ہیں۔عبداللہ حسین کا وہ ناول جس میں ان کی فنی انفرادیت اور بصیرت بھرپور طریقے سے اپنے نقطہء عروج پہ نظر آتی ہے وہ ''نادار لوگ'' ہے جو سانحہ مشرقی پاکستان کے تکلیف دہ سیاسی وسماجی حالات کے تناظر میں تخلیق کیا گیا ہے۔عبداللہ حسین کا ضخیم ناول نادار لوگ کے افسانوی بیانیے سانحہ مشرقی پاکستان کے سیاسی وسماجی حالات کے اتار چڑھاؤ کی اذیت وکرب سے بھر پور داستان کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔تخلیقی حوالے سے دیکھا جائے تو اس ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کو فنکارانہ مہارت برتتے ہوئے ''حال'' سے ماضی کے سفر کو بڑے عمدہ طریقے سے اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ناول کے بیانیے میں حال ایک استحصال شدہ سامراجی معاشرے میں اپنی زندگی کی بقاء کے لئے جدوجہد کرتی ایک پسماندہ نسل کی غمازی کرتا ہے۔جہاں 'ماضی'' دم توڑتی اقدار اور روایات کے تحت بے حسی اور بیگانگی جیسے رویوں کی اوٹ سے باربار جھلکتا ہے۔

بنیادی طور پر نادار لوگ ایک ایسی نادار قوم کی کہانی ہے جو نسل درنسل غلامی کا طوق پہنے اپنے اوپر مسلط کیے جانے والے ہر ڈکٹیٹر،سیاست دان یا جاگیردار کے آگے اپنا سر مشیت ایزدی سمجھ کر جھکا دیتی ہے۔''نادار لوگ'' کے تاریخی بیانیے اور مکالمے اپنے اسلوب کی بنا پر دیگر ناولوں کے مقابلے میں جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

نادار لوگ کے افسانوی بیانیوں کا تجزیہ ذیل میں درج ہے۔

تقسیم سے قبل مسلم سکھ معاشرے کا باہمی میل جول:

نادار لوگ ناول میں تقسیم ہند سے پہلے کے حالات کو عام واقعات سے ہٹ کر نئے اور اچھوتے انداز میں افسانوی بیانیے کے ذریعے مصنف نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ متحدہ ہندوستان کے وہ حالات کہ جو دو قوموں یعنی مسلم اور خاص کر سکھ برادری کے متعلق مصنف نے فکشن میں مختلف چھوٹے بڑے بیانیوں کے ذریعے اور افسانوی اسلوب اپنا کر قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ انداز اسلوب کو فکشن سے ہٹ کر دیگر ذرائع سے بھی ان واقعات کو بخوبی پرکھا جا سکتا ہے لیکن ایک ناول نگار جب ماضی کے واقعات

کو بیان کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کئی قسم کے خیالات،مناظر اورواقعات ہوتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ ماضی کے ان حالات و واقعات کو قاری تک اس طرح پہنچائے کہ نہ تو قاری پڑھنے میں دشواری محسوس کرے اور نہ ہی اسے ان واقعات کو پڑھنے کے بعد تھکاوٹ محسوس ہو یعنی نہ ہی زیادہ طویل اور نہ ہی اکتادینے والے بیانیے ہوں بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ قاری کے لئے ان میں تجسس اور دلچسپی کا سامان ضرور فراہم کرے۔اسی طرح نادار لوگ کے جتنے بھی تاریخی بیانیے افسانوی انداز میں ہماری نظروں کے سامنے آئینگے ان میں سے کچھ تو مکالموں کے انداز میں اور کچھ قصہ گوئی کے انداز میں اور زیادہ تر افسانوی بیانیوں کی صورت میں ہم تک پہنچیں گے۔اس وقت جس بیانیہ کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ تقسیم ہند سے قبل کے حالات اور سکھ مسلم کے باہمی تعلقات پر مبنی ہے۔عبداللہ حسین ایک جگہ نادار لوگ میں لکھتے ہیں:

''امرتسر کے نواح میں سکھوں کے اس چھوٹے سے گاؤں ''کبیر سنگھ والا'' میں
اعوانوں کا ایک ہی مسلمان گھرانہ تھا'' (۱)

اگر چہ ہندوستان میں مسلمانوں اور سکھوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی آباد تھیں لیکن مصنف نے صرف اور صرف سکھ قوم کا ذکر مسلم قوم کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا جواب تو وہی بہتر دے سکتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کا ذکر کیوں نہیں کیا بہر حال یہاں بیانیہ میں سکھ قوم کے تعلقات مسلم برادری کے ساتھ کیسے تھے اور کیونکر تھے اس پر بیانیہ میں بحث کی جاسکتی ہے۔سکھ اور مسلمانوں کے درمیان باہمی میل جول کا یہ عالم تھا کہ'' کبیر سنگھ والا'' گاؤں میں صرف ایک گھرانہ اعوان خاندان کا تھا جو سکھوں کی اکثریت کے باوجود یہاں انہیں ہر طرح کی آزادی تھی اور کبھی بھی اعوان خاندان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ورنہ جس جگہ اکثریت مخالف قوم کی ہو وہاں حالات سازگار نہیں رہتے۔مصنف بیانیہ کو افسانوی انداز میں ڈالتے ہوئے قاری کی توجہ ان واقعات کی نزاکت اور ان کی اہمیت پر مرکوز رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔حالانکہ مصنف ماضی کے واقعات کو فکشن کے اسلوب میں اس سے قبل ناول اُداس نسلیں میں بھی بیان کر چکا ہے مگر جو بات نادار لوگ کے بیانیوں کی ہے وہ اُداس نسلیں کی نہیں ہوسکتی۔تاریخی کتب کے صفحات پر سکھ مسلم قوموں کے تعلقات مختلف انداز اور مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے بیان کئے جا چکے ہیں اور ان میں سے بہت سے مصنفین نے ان کے میل جول اور باہمی میلاپ کا ذکر انتہائی مثبت انداز میں کیا ہے جس سے

آنے والی دونوں قوموں کے نسلوں پر مثبت اثرات مرتب ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں لیکن اس کے برعکس کچھ تاریخ دانوں نے ان تعلقات کو انتہائی منفی انداز میں پیش کر کے سکھ مسلم اقوام کے درمیان بہت بڑی خلیج کھڑی کرنے کی کوشش کی ہے۔

دیکھا جائے تو ناول نادار لوگ کے اس بیانیہ میں تقسیم سے قبل مسلم سکھ معاشرے کا باہمی میل جول کا بیانیہ افسانوی انداز اسلوب میں لکھا گیا ہے اور اس بیانیہ کو ناول کے ابتداء ہی میں رکھا گیا ہے۔ مصنف تقسیم سے پہلے کے حالات کو قصہ گوئی کے انداز میں لکھتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ قاری ذرہ برابر بھی اکتاہٹ محسوس نہ کرے۔ متحدہ ہندوستان میں سکھ، مسلم اور دوسری قومیں مشترکہ آباد تھی لیکن مصنف نے ناول میں سکھ اور مسلم قوم کے قبل از تقسیم ہند کے حالات کو انتہائی مثبت انداز میں بیانیے کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ناول کے ابتداء ہی میں مصنف نے ''کبیر سنگھ ولا'' گاؤں کا ذکر کیا ہے جہا یعقوب اعوان اور اس کا والد ایوب اعوان رہتے تھے اس گاؤں میں سکھ اکثریت میں جبکہ مسلمانوں کا ایک ہی گھرانہ آباد تھا لیکن ان کے آپسی تعلقات باہمی میل جول کو بیان کیا گیا ہے۔ایک جگہ مصنف ان کے باہمی میل جول کے بارے میں رقمطراز ہے کہ:

> ''پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی ۔یعقوب اعوان اس وقت سترہ برس کا تھا گاؤں سے بھرتی ہونے والے آٹھ لڑکوں میں جگت سنگھ شامل نہ تھا اور یعقوب اعوان سوچ رہا تھا کہ جگو کہاں جا کر چھپا ہوگا۔جب بھرتی والے چلے گئے تو جگت سنگھ نے اکر بتایا کہ وہ کسی کھیت میں نہیں بلکہ اپنے کھلیان میں توڑی کے ڈھیر کے اندر چھپ کر بیٹھا رہا تھا'' (۲)

اگر دیکھا جائے تو نادار لوگ میں ان بیانیوں کو کسی حد تک قصہ گوئی کے انداز میں پیش کیا گیا ہے جو کسی خاص مقصد کو ابھارنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہ قبل از تقسیم ہند سکھ مسلم تعلقات پر بحث کرتا ہے۔مصنف کا قصہ گوئی کو اعتبار بخشنے کی وجہ سے بیانیہ کی ہیئت الگ نوعیت کی دکھائی دیتی ہے یعنی بیانیہ جوں جوں آگے بڑھتا ہے ساتھ ہی ساتھ اس کی ہیئت بھی بدلتی رہتی ہے۔

مصنف اپنے ناول اُداس نسلیں میں تقسیم ہند سے قبل کے حالات کا ذکر پہلے ہی افسانوی انداز

میں کر چکا ہے مگر نادار لوگ میں بھی انداز بدل کر تقسیم ہند سے قبل سکھ مسلم میل جول کا ذکر بھی یہاں کر رہا ہے۔مصنف نے واقعے کا ذکر کرتے ہوئے یعقوب اعوان اور اس کے باپ ایوب اعوان کے سکھوں کے ساتھ تعلقات اور ان کے رہائشی مسکن ''کبیر سنگھ والا'' گاؤں جس میں سکھ اکثریت میں رہتے تھے اور مسلمانوں کا صرف ایک ہی گھرانہ آباد تھا کا ذکر بہت ہی خوشگوار انداز میں کرتے ہوئے عبداللہ حسین نے فسادات کے واقعات اور حالات کو افسانوی بیانیہ کے ذریعے بتانے کی کوشش کی ہے کہ فسادات کے وقت قبل از تقسیم ہند اس گاؤں کے رہنے والے سکھ یعقوب اعوان کے خاندان کو کس طرح بلوائیوں سے بچاتے ہیں اور بحفاظت مسلم اکثریتی گاؤں تک پہنچنے میں مدد کرتے ہیں۔ مصنف واقعات کو مزید دلچسپ بنانے کے لئے دونوں برادریوں کے اپنے اپنے علاقوں سے ایک دوسرے کے ہاں حال احوال پوچھنے کی غرض سے تقسیم ہند کے بعد آنے جانے کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ان کے باہمی اتفاق اور دوستی کے اس رشتے کو سرحدوں کے قیود سے پاک قرار دینے میں وہ عار محسوس نہیں کرتے۔اس سے مصنف کی مراد گزشتہ محبت کا جوش دکھانا ہے۔مصنف کے دوسرے ناول اُداس نسلیں میں جو سکھ معاشرہ دکھایا گیا ہے وہ مقامی روایات کے لحاظ سے اعلیٰ اخلاقی روایات کا پاسدار تھا۔اپنے دونوں ناولوں میں عبداللہ حسین نے جہاں مسلمانوں اور سکھوں کے باہمی محبت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ ناولوں کے بیانیوں میں ہندوؤں کے بجائے عبداللہ حسین نے سکھوں کو فوقیت دی ہے حالانکہ ہندو متحدہ ہندوستان میں اکثریت میں تھے اور ہیں۔یہ تو معلوم نہیں کہ مصنف نے ہندوؤں کے مقابلے میں سکھوں کو یہ خراج تحسین شعوری طور پر پیش کیا ہے یا پنجاب پنجابی کے ناتے سے وہ سکھوں کو اپنے معاشرے کا ہی حصہ سمجھتے ہیں۔ایک ایسا معاشرہ جو مشترکہ ثقافت کا حامل ہونے کے باوجود سیاسی مفادات کی لکیر تلے دولخت ہوئے پڑا ہے۔یا پھر اس کی وجہ محض یہ ہوسکتی ہے کہ تقسیم ہند سے قبل مصنف نے اپنے علاقے میں صرف سکھ ہی دیکھے ہوں جن کی یادیں ان کے لاشعور میں ہمیشہ کے لئے رخ کر گئی ہیں اور ہندوؤں کو انہوں نے دیکھا ہی نہ تھا اس لئے وہ انہیں اپنے ناول میں پیش نہ کرسکے۔ البتہ اس بیانیہ سے یکسر ہندوؤں کو نکال باہر کر لینے کے سوال و جواب تو صرف اور صرف مصنف ہی دے سکتا ہے۔

تقسیم ہند اور مسائل ہجرت:

ناول نادار لوگ میں بیانیہ چونکہ اپنی ہئیت بدلتا رہتا ہے اس لئے جہاں جہاں ان واقعات کا ذکر

آیا ہے وہاں بیانیہ میں ہیئت کے مطابق تبدیلی آئی ہے۔ اس بیانیہ میں مصنف نے نہایت باریک بینی سے کام لیتے ہوئے تقسیم ہند اور اس ضمن میں ہجرت کے مسائل کو چھیڑا ہے۔ اگر چہ ان مسائل پر اس کے بعد اور اس سے قبل بہت سے تاریخ دانوں نے قلم اٹھایا ہے مگر عبداللہ حسین نے جس طرح سے ان مسائل کو اپنی فنکارانہ فکشن میں سمونے کی کوشش کی ہے شاید ہی کوئی ناول نگار اتنی باریک بینی سے ان واقعات کا اتنی تفصیل کے ساتھ جائزہ لے سکے۔ تاریخی کتب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کسی نے ان واقعات کو اپنے نظمیہ انداز میں تو کسی نے مکالموں کے انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح کسی نے کہانی کے انداز میں تو کسی نے قصہ گوئی کی شکل میں ان واقعات کو اپنی تاریخی کتب میں جگہ دی ہے یعنی ہر ایک نے اسے اپنے اپنے انداز و اسلوب میں بیان کیا ہے۔ بحر حال اصل مقصد قاری تک ان تاریخی واقعات کو ہو بخو حقیقت پسندانہ انداز میں پہنچانا مقصود ہے۔ عبداللہ حسین نے ان واقعات کو قصہ گوئی کے انداز میں ہم تک پہنچایا۔ جس کی زبان انتہائی سلیس اور ہر ایک کی سمجھ میں آنے والے الفاظ کے چناؤ کے ساتھ جو قاری کی معلومات میں اضافہ کا سبب بننے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان جیسے کئی دوسرے بیانیوں کی بنا پر ہم ان کے ہم عصر ناولوں کی لسٹ میں نادار لوگ کو امتیازی حیثیت سے پہچان سکتے ہیں۔

عبداللہ حسین اور مستنصر حسین تارڑ ہم عصر ناول نگار ہونے کی وجہ سے ان کے اکثر ناولوں میں یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ عبداللہ حسین کا ناول نادار لوگ کا زمانہ اور وقت تقریبا ایک ہی ہے اس لئے ان کے بیانیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اسی طرح ان دونوں ناولوں کے قصے اور کہانیاں بھی ایک دوسرے سے کافی مماثلت رکھتی ہیں یا پھر دونوں ناولوں کے قصوں میں معمولی نوعیت کا فرق دیکھنے کو ملے گا اور وہ فرق ہے مکالموں کا یعنی عبداللہ حسین کے ہاں بیانیوں میں مکالموں کا انداز اپنایا گیا ہے جبکہ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں مکالموں سے کم ہی کام لیا گیا ہے۔ جہاں مکالموں کی ضرورت محسوس کی گئی تو وہاں عبداللہ حسین نے بیانیہ کو معنی خیز بنانے کے لئے مکالمے کا سہارہ لیا ہے جو کہ بات کو سمجھانے کا ایک انتہائی آسان اور کار آمد طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ مستنصر حسین تارڑ نے اس کی بجائے سیدھے سادھے الفاز میں بیانیہ ہی میں کہانی کو بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اسی وجہ سے زیر بحث بیانیہ میں مصنف نے مکالمہ کی وجہ سے اس بیانیہ کو جاندار بنا دیا ہے جبکہ ان کے مقابلے میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ میں مکالموں سے کام نہ لے کر اسے سادہ ہی رکھا گیا ہے۔

ہجرت کی صعوبتوں،مسائل و مصائب کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نادار لوگ میں لکھتے ہیں کہ:

''سال چڑھا تو افواہیں پھیلنی شروع ہوئیں کہ آبادی کی ادل بدل شروع ہو چکی ہے۔پھر فساد اور مار دھاڑ کی کہانیاں کانوں تک پہنچنے لگیں۔'' (۳)

عبداللہ حسین دور کی سمجھ رکھنے والے ناول نگار ہونے کی بنا پر اپنے انداز بیاں پر خاصی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی فنکاری کا ان کے اس ناول کے بیانیہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں بیانیہ میں انکی توجہ اجمالی واقعات پر مرکوز رہی ہے وہاں اس کے علاوہ مصنف اس بات سے بھی واقف ہیں کہ ان واقعات کی نوعیت اور ان کی شدت قاری کس حد تک محسوس کرسکتا ہے۔

مصنف جہاں واقعات کو شدت کے ساتھ پیش کرنے کا فن رکھتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ ایک دو جملوں میں پورے کے پورے واقعہ کو فکشن میں بیان کرنے کا ماہر بھی دکھائی دیتا ہے۔بیانیہ میں ہندوستان کے بٹوارے کے بارے میں ہندوستانی عوام کی دلچسپی اور توجہ کو مصنف انتہائی اعلیٰ اور بہتر انداز میں پیش کرتا ہے۔اب چونکہ بٹوارے کے بارے میں تمام ہندوستانی عوام کو پتہ چل چکا تھا اور افواہیں عام گردش کر رہی تھیں اور تو اور یہ افواہیں اب صداقت کی شکل اختیار کر رہی تھیں۔مصنف ہندوستان کے تقسیم ہونے کے واقعے کو اس انداز میں بیان کررہا ہے کہ جیسے وہ واقعات ہماری انکھوں کے سامنے وقوع پزیر ہو رہے ہیں۔ چونکہ مسلم قوم کے مستقبل کا فیصلہ ہونا تھا اس لئے مسلمان کی خوشی کی انتہا نہ رہی جبکہ مخالفین اس کے برعکس فسادات کی طرف مائل دکھائی دے رہے ہیں۔بیانیہ کی روح سے جیسے ہی بٹوارے کی افواہیں پھیلنے لگتی ہیں ساتھ ہی ساتھ مصنف اس کے ردعمل کے طور پر ان فسادات کا بھی ذکر کرنے سے کتراتے نہیں بلکہ کھلے عام ان فسادات کا ذکر کردیتے ہیں۔ ایک اور مقام پر ہجرت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مقام کہ جس پر وہ جدی پشتی رہائشی تھے اب اس مقام کی کوئی اہمیت دکھائی نہیں دے رہی ہے اس بارے میں مصنف لکھتا ہے کہ:

''یعقوب اعوان کو ایک پل کے لئے بھی اس بات کا گمان نہ ہوا کہ وہ نقل مکانی کرے۔'' (۴)

انسانی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ جس جگہ انسان خوشی اور ذاتی،مالی،بدنی تحفظ کو یقینی سمجھتا

ہے وہاں سے چلے جانا سوائے کسی بڑی مجبوری کے مشکل ہوتا ہے۔یعقوب اعوان کے خاندان اور سکھوں کے درمیان بھی اسی نوعیت کا پیار اور جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ جو مسکن آرام دہ ہوتا ہے اُس جگہ کو چھوڑ کر چلے جانے کو دل نہیں کرتا۔

فسادات کی زد میں آنے والی بے گناہ عورتیں اور بچوں کی چیخ و پکار کی وجہ سے پر امن ہجرت کو فسادیوں اور بلوائیوں نے نہتی عورتوں اور بچوں کے خون سے رنگین کر دیا۔بلوائیوں کی طرف سے بچوں اور عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو مصنف نے ناول کے افسانوی بیانیہ میں قلم بند کرتے ہوئے اسے ظالم ہوا سے تعبیر کیا اور کہا کہ ان مظالم کی بناء پر آگ کے شعلے ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پھیل گئے جس کی وجہ سے فسادات کی رفتار مزید بڑھی اور جس جس علاقے میں اس ظلم و زیادتی کی خبر جاتی وہاں مزید خون کی ہولیاں کھیلی جاتیں اور چیخ و پکار اور آہ و بقاء کی وجہ سے آدمی کی باطن میں چھپی ہوئی دیوانگی اس طرح زمین پر پھیلی کہ انسان اور حیوان دونوں کا گزر مشکل دکھائی دینے لگا۔

مصنف جہاں بیانیہ میں انسانی جانوں پر ظلم کا ذکر کرتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ جانوروں کا ذکر بھی کرتا ہے کہ انسان تو انسان جانوروں نے بھی اس ماحول کو ناپسند کیا اور ان کا رویہ بھی تبدیل دکھائی دیا جو کہ اس خطے کی سلامتی اور امن و امان کے لئے زہر تھا۔یعنی ان میں بھی وہی سہما پن اور وہی خوف طاری ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے جسے مصنف نے اپنے ناول میں کچھ ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

> ''یعقوب اعوان کو یاد آیا کہ اس عجیب وقت میں جانوروں کے اندر ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی تھی ۔بڑے بڑے خونخوار کتے،منہ زور گھوڑے اور اڑیل مویشی منہ اُٹھا کے آسمان کو دیکھنے اور گردن موڑ لیتے تھے انکی بے زبان نظروں میں مستقل کھٹکا در آیا تھا اور چال میں پہلوتہی کا انداز آ گیا تھا جیسے ان پر عیاں ہو گیا ہو کہ آدمی کے اندر ایک جان لیوا بیماری کی وبا پھیل گئی ہے اور جانور کسی ان دیکھی راہ فرار کی تلاش میں ہوں آدمی کو قریب آتے دیکھ کر بدک جاتے اور آنکھوں میں سہم لئے سرکنے لگتے۔'' (۵)

دوران ہجرت مظالم کی شدت بھرے واقعات نے مصنف کو نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں کے متاثر ہونے کے مناظر کو بھی قلم بند کرنے پر مجبور کیا جس سے اس بیانیہ کے دیگر تاریخی واقعات کی طرح سچا ہونے کی دلیل مانی جا سکتی ہے۔وہ جانور جو کہ انہی انسانوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے وہ بھی آج ان سے دور رہنے اور ان سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں۔یہ مصنف کے نزدیک صرف اور صرف بے گناہوں کے خون کا صلہ تھا کہ جس کی وجہ سے حیوان بھی اپنی اصل حالت کو چھوڑ گئے۔مصنف قاری کے سامنے ماضی کے وہ تمام فسادات جو کہ دوران ہجرت رونما ہوئے تھے کا حال بیان کرتے ہوئے ہرگز نہیں تھکتا اور ساتھ ہی گاؤں ''کبیر سنگھ والا'' کے مسلمان خاندان کی مشکلات اور مصائب کا ذکر کرتا ہے اور ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

''آخر وہ دن بھی آیا جب بھگت سنگھ نے آکر کہا ''فسادی ہمارے گڑھ آپہنچے ہیں۔اُٹھ کے ہمارے ڈیرے پے آجا۔'' (۶)

قاری کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے اس تاریخی افسانوی بیانیے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہانی میں بجائے قاری کو الجھانے کے اس کے لئے مزید تجسس کا سامان پیدا کرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔اس طرح قاری بیانیہ کے آغاز سے لیکر انجام تک کے سفر کو با آسانی سمجھ لیتا ہے۔جہاں مصنف قاری کو مشکلات اور مصائب کی شدت کے بارے میں بتاتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ ان مصائب اور مشکلات کو دور کرنے کے لئے دونوں خاندانوں کے مابین اتفاق اور ان مصائب و الام پر قابو پانے کے لئے ان کے باہم پیار و محبت کے جذبات کو بھی پروان چڑھتے ہوئے دکھاتا ہے۔ان نیک جذبات اور آپس میں پیار کی وجہ سے بہت سی ایسی مشکلات جو کہ شائد آگے جا کر اور مزید بربادی کا باعث بنتے قابو پانے میں مددگار ثابت ہوئے۔اب چونکہ فسادات بڑھ رہے تھے اور بات لڑائی جھگڑے اور مارا ماری تک آگئی تھی اس لئے مسلمان خاندان گاؤں ''کبیر سنگھ والا'' میں محسور ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ جہاں لوگ ان کے حامی تھے وہاں مخالفت بھی زیادہ تھی جس کی وجہ سے بچنے کی امید کم تھی۔اس لئے اب مصنف کے نزدیک اُمید کی ایک ہی کرن باقی تھی اور وہ تھے بھگت سنگھ جو کہ اعوان خاندان کی محبت اور کئی سالوں سے اکھٹے اٹھنے بیٹھنے کے بدلے کو چھکانا چاہتا تھا اس لئے وہ اعوان خاندان کو بلوائیوں سے بچانے کے لئے اپنے گھر میں پناہ دینے کی خاطر دعوت دیتا ہے تاکہ مسلمان خاندان کسی نہ کسی طرح ان فسادات کی نظر ہونے سے بچ جائے۔تقسیم ہند کے تمام واقعات کو تو نہیں لیکن زیادہ سے زیادہ شدید قسم کے واقعات کو اپنے قلم کے ذریعے ناول کے

مختلف افسانوی بیانیوں اور مکالموں میں کسی نہ کسی حد تک مصنف نے قاری تک پہنچا دیا۔ جس کی انہیں اس فن ناول نگاری کی داد نہ دینا سراسر بے انصافی ہوگی۔

ملکی انتظام و انصرام میں بدعنوانی:

تقسیم ہند کے بعد ملک کا انتظام و انصرام جن لوگوں کے ہاتھوں میں آیا انہوں نے ملک کو بدعنوانی کا گڑھ بنانے سے دریغ نہ کیا ان کی انہی بدعنوانیوں کو مصنف نے اپنے اس بیانیہ میں ذکر کیا ہے۔ پاکستان کے اندر کے حالات کا ذکر مصنف نے بڑے ہی ڈراؤنے انداز میں کیا ہے۔ مصنف نے ہر اُس واقعہ کو کھول کر بیان کر دیا ہے کہ جس کا ذکر کسی بھی تاریخی حوالے سے کرنا مناسب تھا۔ مصنف نادار لوگ میں تقسیم کے بعد ملک کے نظم و نسق کے بارے میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ''میری ساڑھے بارہ کلے زمین ہے۔ یعقوب اعوان نے کہا۔ اوئے بے عقلے ہے کہاں؟ وہ تو اُدھر رہ گئی۔ اب واپس جانے آنے کی بات چھوڑ۔ ادھر بے انت زمین خالی پڑی ہے۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر قبضہ کر رہے ہیں اب تو اپنی قوم میں آ گیا ہے۔ ادھر والوں میں اتفاق ہے۔ تیرا لڑکا اللہ کے فضل سے جوان ہے۔ ہم تین گھرانے متفق ہیں۔ تو بھی آ کر ساتھ مل جا۔ رائے بشن داس کے دس مربعے خالی پڑے ہیں۔ ڈھائی ڈھائی ہر ایک کے حصے آ جائیں گے۔'' (۷)

ہندوستان کی تقسیم کے بعد جو حصہ پاکستان میں آیا وہاں سے مسلمانوں کے علاوہ جو بھارت میں جانا چاہتے تھے وہ چلے گئے تھے اور جو بھارت سے آنا چاہتے تھے وہ ہجرت کر کے پاکستان آ کر آباد ہو رہے تھے۔ اب ان کی رہائش کے مسائل نے ان مہاجرین کو آلیا تھا۔ مصنف بیانیہ میں تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت کرنے والے لوگوں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے ذکر کرتا ہے جو مہاجرین پاکستان آ گئے تھے اب یہاں ان کے لئے حالات سازگار نہ تھے کیونکہ ان کے لئے رہائش اور ذریعہء معاش کا بندوبست کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری تھی لیکن مصنف کے بقول تقسیم کے بعد وہ لوگ جو وہاں زمینیں اور جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے یہاں اس نوعیت کی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی صورتحال تھی جو کہ واقعی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک اپنی جائیدادیں ہندوستان

میں چھوڑ کر آئے مگر جس ملک کی خاطر وہ یہ سب کچھ کر بیٹھے یہاں ان خاندانوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑااور بہت سی مصیبتیں برداشت کیں۔ یہ لوگ بے سر و سامانی کے عالم میں آئے مگر یہاں پر بھی ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ ان میں سے جس خاندان کا کوئی نمائندہ حکومت میں ہوتا تو ان کو کم مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور ان کو یہاں پر بھی جائیدادیں ملیں اس لئے گاؤں ''کبیر سنگھ والا'' سے ہجرت کرنے والے خاندان کا ذکر مصنف اپنے بیانیہ میں کر رہا ہے۔ اعوان خاندان سکھوں کے جس اکثریتی گاؤں کو چھوڑ کر آیا تھا اور سسرالی گاؤں میں آ کر آباد ہوا تھا یہاں بھی وہ جائیداد کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اسی لئے شیر بہادر جو اس کے سسرالی گاؤں میں سے تھا اسے مشورہ دیتا ہے کہ تیرا بیٹا جوان ہے یعنی وہ اس قابل ہے کہ تیرا ساتھ دے اور ساتھ ہی ذات پات کے چکر میں اسے ڈھلنے کا مشورہ بھی دے دیا۔ اور کہا کہ یہاں سب لوگ جائیدادوں پر قابض ہو رہے ہیں پھر یہاں اعوانوں کی اکثریت کی وجہ سے تمہارے لیے قبضہ آسان ہے لہٰذا دیر مت کرو اور فوراً قبضہ کرو۔ یہاں بیانیہ طویل ہونے کے باوجود تجسس کی طرف بڑھتا ہے کیونکہ مصنف نے باریک سے باریک تاریخی لمحات کو بھی نہیں چھوڑا اور ذکر کر ڈالا۔ یہاں سسرالیوں نے انہیں اپنے تعاون کا یقین دلایا کہ وہ سب تمہارا ساتھ دیں گے۔ مصنف نے حکومت وقت کی بدعنوانیوں سے پردہ اُٹھاتے ہوئے رائے بشن داس جو کہ اس گاؤں کا ایک اعلیٰ زمیندار رہ چکا تھا جو دس مربعے جائیداد کا مالک رہا تھا اب تقسیم ہندوستان کے بعد وہ جا چکا تھا۔ جیسے تقسیم ہند کے بعد کچھ پاکستان میں رہنا چاہتے تھے تو وہ یہیں رک گئے اور کچھ لوگ جو ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے وہ پاکستان چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ ان میں سے بشن داس بھی ایک تھا جو اپنی جائیداد پاکستان چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی جائیداد پر قابض ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ حالانکہ یعقوب اعوان اپنی جائیداد وہاں چھوڑ آیا تھا لیکن حکومتی بدعنوانیوں کے باعث بغیر کسی ثبوت کے معمولی جعلی کاغزات کے عوض اور حکومتی مشینری میں اچھے عہدے پر فائز کسی رشتہ دار یا پھر رشوت کے ذریعے جائیداد ہتھیانے کی خواہش نے ان کو اندھا کر دیا تھا۔ بدعنوان افسران جو کہ حکومت میں کئی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے کے متعلق ''نادار لوگ'' میں لکھتا ہے:

> ''فلک شیر اوان مہاجرین کے محکمے میں ڈپٹی کمشنر لگا ہوا ہے'' علی بہادر نے تشریح کی ،'' نور پور کے اوانوں کو اس نے مہاجنوں کے امرودوں کا باغ الاٹ کرا کے دیا ہے۔ کاغذ واغذ سب اپنے پاس سے بنا کر دیئے ہیں۔ برادری کا

آدمی ہے ہل نہیں سکتا۔'' (۸)

مصنف اس وقت کے حکومتی یا سرکاری بدعنوان افسران کا ذکر کرتے ہیں جن میں فلک شیر جو کہ اعلیٰ حکومتی عہدے پر فائز ہے کی بدعنوانی کا ذکر بھی خاص طور پر کرتا ہے کہ وہ اپنے محکمے کا کرپٹ ترین انسان ہے جو اقربہ پروری سے کام لے کے حکومت کو بدنام کرنے کا باعث بنا۔فلک شیر جو کہ محکمے میں ڈپٹی کمشنر لگا ہوا تھا جس سے فائدہ اٹھانے کے لئے یعقوب اعوان کو جائیداد کے حصول کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یہاں مصنف صرف اس بات پر اکتفا نہیں کرتا کہ ڈپٹی کمشنر کی ذات اعوان ذات ہونے کی بنا پر ساتھ دے گا بلکہ وہ بدعنوانی کے ثبوت کے ساتھ کہ جو فلک شیر نے نور پور کے اعوانوں کو مہاجنوں کا امرودوں والا باغ الاٹ کیا تھا۔یعنی اب تو کوئی مشکل بات ہی نہیں پہلے سے ہی راستہ ہموار ہے یعنی یہ تو سونے پے سہاگہ والی بات ہے کہ جس کی مثال پہلے سے موجود ہے اس طرح مصنف نے اپنے بیانیہ سے سچ ثابت کر کے دکھا دیا ہے۔

ناول کو مزید دلچسپ اور حقیقت پر مبنی بنانے کے لئے بیانیہ میں مکالموں سے بھی خوب فائدہ اٹھایا گیا ہے۔جہاں جہاں مصنف کو بات سمجھانے میں دقت پیش آئی وہاں وہاں اس نے مکالموں کا استعمال کیا ہے جن سے معنی اور مصنف کی بات کی تائید اور تحقیق میں خاطر خواہ مدد ملتی ہے۔حکومتی سطح پر تقسیم ہند کے بعد جو بدعنوانی مصنف نے بیان کی وہ تو صرف اور صرف جائیداد کی حد تک تھی اس کے علاوہ دیگر شعبہ جات میں بھی تقریباً یہی حال رہا ہوگا۔

ہجرت کے بعد کے حالات کو مصنف اپنی تمام تر فنی خوبیوں کے ساتھ بیان کرتا ہے جس سے بیانیہ کی تاریخی کہانی کو سمجھنے اور ان واقعات کی تہہ تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔مصنف جائیداد کے قبضے کو خاندانوں کے وقار سے جوڑنے کا اشارہ دیتا ہے۔بیانیہ میں جائیداد کے قبضے کو خاندانوں کے وقار سے جوڑنے کا اشارہ ملتا ا ہے۔کیونکہ جس شخص کو جہاں بہتر اور فائدہ پہنچانے والی زمین قبضہ میں ملی اس نے بزور بازو اس پر قبضہ کر کے ہتھیالی۔ ہجرت کی وجہ سے غیر مسلموں جن میں خصوصاً ایسے سکھ خاندان کہ جو دولتمند اور صاحب حیثیت ہونے کہ وجہ سے اپنے علاقوں میں جانے پہچانے جاتے تھے ہجرت کے بعد اپنی تمام جائیدادوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور مجبوراً انہیں یہ زمینیں، محلات اور حویلیاں چھوڑنا پڑیں اس طرح یہ عالی شان

محلات اور حویلیاں مہاجرین کے قبضے میں یا پھر حکومت وقت نے اپنی تحویل میں لے لیں۔ان بڑی بڑی جائیدادوں،محلات اور حویلیوں کے مالکان میں جن کا مصنف انتہاں شدت کے ساتھ اپنے اس بیانیہ میں ذکر کرتے ہیں رائے بشن داس اور دوسرے رائے بہادر شیر سنگھ جی ہیں۔ان میں سے رائے بشن داس تو بٹوارے سے قبل ہی یہ علاقہ چھوڑکر بھاگ نکلے جبکہ رائے بہادر شیر سنگھ جی جو ایک پڑھے لکھے روشن خیال آدمی تھے ان کے مسلمانوں،سکھوں اور انگریز کے ساتھ یکساں تعلقات تھے چنانچہ پاکستان بننے کے پورے ایک سال تک وہ اپنی جائیداد پر قابض رہے ان کے خلاف کئی قسم کی افواہیں گردش میں رہیں کسی نے کہا کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور کسی نے کہا کہ اس نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام تبدیل کرلیا ہے۔مصنف کہتا ہے کہ اصل میں اس کی جائیداد کو انکی موجودگی میں ایک شخص نے جعلی کلیم داخل کر کے قبضہ جما لیا تھا جس کی وجہ سے وہ دلبرداشتہ ہوکر دلی جا بسا۔مصنف نے اپنے اس نیم افسانوی بیانیے کے ذریعے ہجرت کے بعد پاکستانی حکومت میں انتظامی بدعنوانی کو سمیٹتے ہوئے کئی دوسرے واقعات اور مسائل کو قاری کی دلچسپی اور ماضی کے تاریخی تشنگی کو دور کرنے کے لئے بیانیہ میں قلم بند کئے جن کی تفصیل دوسرے آنے والے بیانیوں میں پیش کی جائے گی۔

کسان یونینز اور بھٹہ خشت مزدوروں کی نسل درنسل غلامی:

جہاں دوران ہجرت ہر طرح کے مسائل نے جنم لیا اور کئی المیے رونما ہوئے وہاں سیاسی میدان بھی خاصہ گرم رہا اور یونینز خواہ کسان یونینز کے مسائل ہوں یا پھر مزدور طبقہ کے حالات ہوں سیاسی لحاظ سے گھمبیر دکھائی دیتے تھے۔ہر طرف ظلم و زیادتی کا دور دورہ تھا۔ان کی یونین کا ہونا اور نہ ہونا برابر تھا۔تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں مزدور اور کسان در بدر ہونے کی وجہ سے خاصے پریشان تھے کیونکہ ان کے پاس اب نہ تو ہجرت سے پہلے کی زمینیں تھیں اور اگر تھیں بھی تو وہ اس جیسی فصل دینے کے قابل نہ تھیں اس لیے کسان میں اپنے تحفظ اور معاشی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر بڑھنے لگی۔مصنف ناول میں ایک مقام پر بھٹہ مذدوروں کی دردناک صورتحال کو بیان کرنے کے لئے ایک ایسی عورت کہ جس کا تعلق غریب مزدور خاندان سے ہوتا ہے۔اس پر اور اس کے دوسرے خاندان کے افراد پر جو مظالم ڈھائے گئے ان کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کرتا ہے:

''ملک جی بچالو ،اللہ کے نام پر رحم کرو ملک جی!عورت اعجاز کی قمیض کھینچتے
ہوئے بولی، میرے آدمی کو بچالو،ظالم اس کی جان لے لیں گے۔میری اور
میرے بچے کی مدد کرو،تمہیں خدا کا واسطہ۔'' (۹)

بھٹہ خشت مزدوروں پر بیتنے والے وہ تمام مظالم کو ایک بھر پورداستان اور تاریخی واقعہ کی صورت میں اسکی تمام باریکیوں کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیئے۔ ان مناظر کو انکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے ۔ وہ تمام مظالم جوکہ قلم کی زد میں لانا تو آسان ہوسکتا ہے مگر بیان کرنے کے بعد ان کی شدت کے احساس کو ہر ایک باآسانی محسوس کرسکتا ہے۔زیر بحث بیانیہ میں مکالماتی انداز بیان کم مگر قصہ و کہانی کا اسلوب زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے بیانیہ کی کہانی کو سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ یہاں مصنف نے بھٹہ پر کام کرنے والے مزدوروں کے حالات اور انکے اوپر ہونے والے مظالم کو بے نقاب کیا ہے بھٹہ پر کام کرنے والے افراد مرد،عورتوں اور انکے بچوں پر مشتمل مزدورخاندان ہوتا ہے جس میں سے ایک ایسی عورت کے کردار کے ذریعے مزدورخاندان پرظلم و زیادتی کو واضح کرتا ہے جس سے بھٹہ حشت پر کام کرنے والے مزدوروں کی مشکلات اور مصائب کو سمجھنے میں دیرنہیں لگتی۔ یہ عورت اعجاز نامی شخص کے پاس کھیتوں میں سے نکل کر بھاگتی ہوئی آتی ہے اور اپنے خاوند اور بچے کے اوپر ہونے والے ظلم کے بارے میں شور وغوغہ مچھاتی ہے اور کہتی ہے کہ انہیں بچایا جائے۔ یہاں پر مصنف اس سے قطعہ نظر کہ عورت کون ہے کس ذات سے اس کا تعلق ہے، صرف اس بات کو سامنے رکھتا ہے کہ اس پر ہونے والے مظالم کون ڈھا رہا ہے اور کیوں ڈھا رہا ہے۔اس کے اس کردار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عورت جو بین کررہی تھی بھٹہ حشت پراس کا خاندان کام کرتا تھااور یہ اس وقت کی بات تھی جب پاکستان بن چکا تھا اس کے بعد مختلف قسم کی مزدوری جس میں کچھ غریب خاندان اینٹوں کے بھٹوں پر محنت مزدوری کرنے لگے اور اس طرح وقت دے ساتھ ساتھ وہ ان مالکان کی ظلم و زیادتی کا شکار ہونے لگے جس کی مثال یہ عورت اور اس کا خاندان ہے ۔ اصل میں مصنف ان بھٹہ خشت کو انکی نجی جیل کی صورت میں بیان کر رہا ہے۔ بھٹہ پر کام کرنے والے مزدوروں کے لئے کچے رہائشی گھروندے بھی بنائے گئے تھے جن میں مزدور مزدوری کے بعد رہتے تھے۔ان حالات و واقعات کے ذریعے مصنف یہ بات سمجھانا چاہتا ہے کہ ملک اتنی مشکلات کے بعد حاصل کیا گیا لیکن ملک کی خاطر قربانیاں دینے والے افراد اور خاندانوں کو سکون نہیں پھر بھی میسر نہ آسکا حالانکہ یہی لوگ ملک کے لئے مدد

گار اور ملک کو بنانے والے بازو تھے۔ناول نادار لوگ کا یہ بیانیہ اگر چہ طوالت کے لحاظ سے کاصہ طویل ہے مگر اس کے برعکس تجسس اور آگے کیا ہونے والا ہے والی کیفیت قاری کے تجسس اور دلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔اسی طرح مصنف ''نادار لوگ'' میں اس بیانیہ کی ضمن میں لکھتا ہے کہ:

> ''ایک کچے گھروندے کے سامنے لوگوں کو ہٹاتے جب وہ دروازے تک پہنچے تو اندر کا منظر دیکھ کر سرفراز کا دل دہل گیا وہ جلدی سے اعجاز کی ٹانگوں کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا اور عقب سے سر نکال کر دیکھنے لگا۔دو تنو مند آدمی ایک کالے کلوٹے،سوکھے ،سڑے آدمی کو بے دردی سے پیٹ رہے تھے۔مار کھا تا ہوا آدمی زمین پر پڑا، لاتوں اور گھونسوں کی بوچھاڑ تلے ایک گھڑی کی مانند ادھر سے ادھر لڑھک رہا تھا۔'' (۱۰)

انتہائی باریک بینی سے کام لیتے ہوئے مصنف نے بیانیہ میں ہر اُس تاریخی لمحے اور ہر اس منظر کو بیان کیا کہ جس کی وجہ سے قاری کو اصل حقائق سے آگاہ کیا جا سکے یہی ایک ناول نگار کے فن کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ جو بھی بیان کرے ہر سننے والا پڑھنے والا ایسا محسوس کرے کہ جیسے وہ واقعہ اس وقت ان کے سامنے وقوع پزیر ہو رہا ہو یعنی وہ اپنے آپ کو اس واقعہ کا ایک چشم دید گواہ تصور کریں۔ یہ سب کارستانی اس افسانوی بیانیہ کے انداز اسلوب پر منحصر ہے اسی کو نقاد حضرات ایک اچھے اور تکنیکی ناول نگار کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔مصنف صرف اس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس وقت کے ان چھوٹے چھوٹے گھروندوں کو بھی اپنے بیانیہ میں جگہ دینے کی سعی مسلسل کرتا رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ ہر اس لمحے اور ہر اس وقوع پزیر ہونے والے چھوٹے سے چھوٹے اہم تاریخی واقعات کو قلم بند کرے کہ جس سے کسان اور مزدور طبقے کا تعلق بنتا ہو۔ان تمام بڑے سے بڑے تاریخی واقعات کو تحیل سے حقیقت تک پہنچانے میں ایک کامیاب افسانوی بیانیہ ہی فنکار کی کوشش ہوتی ہے۔مثلاً اگر مصنف ان گھروندوں کو گھر کا نام دے دیتا تو پڑھنے والا قاری وہ اثر کبھی بھی نہ لیتا جو اس گھروندے کے نام سے لیا ہے۔سرفراز نامی کردار جو اس واقعے میں مصیبت زدہ عورت کی مدد اور مشکل میں اس کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا ہے اور دکھاتا ہے کہ جہاں ظلم و زیادتی کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں تو وہاں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو ان ظالموں سے کسی حد تک نجات دلانے میں مدد کرتے ہیں مصنف کا مقصد صرف مظالم کو بیان کرنا،واقعات اور مشکلات کا ذکر کرنا نہیں بلکہ

اُن قربانیوں کو تاریخی خوالوں کے ساتھ گوش گزار کرنا ہے تا کہ قوم ان قربانیوں سے کچھ سبق سیکھ سکے۔اُس وقت کہ جب پاکستان کی خاطر قربانیاں دی گئیں گھر بار چھوڑا اور پاکستان کو ہندوستان پر ترجیح دی تو اس کا صلہ انہیں ان حالات اور مصائب کی شکل میں ملا مگر ملا بھی ان لوگوں سے جو نہ تو دشمن تھے اور نہ ہی دوست یعنی اپنے ہی قوم سے اس قسم کا گلہ کرنا یہاں بجا نہیں ہوگا۔لیکن ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ یہ مصائب اور مظالم جن افراد کی طرف سے روا رکھے گئے ودولت کے پجاری اور مال کے رسیہ تھے اس لیے وہ غریب طبقہ کو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے ان بھٹہ خشت مزدوروں پر ظلم ڈھاتے رہتے تھے ۔ بلکہ صرف یہی نہیں مالکنا ان مزدوروں کو سود کے دلدل میں دھکیل دیتے تھے جس کی وجہ سے لیا گیا قرض وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا اور اس کی ادائیگی نہ کی جا سکتی جس کی وجہ سے بھٹہ مزدور ان کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلام بن کر رہتے اور یہ سلسلہ اسی طرح ساری زندگی جاری رہتا۔ان حالات کو مصنف ناول میں ایک اور جگہ بیان کرتا ہے کہ:

> ''پیشگی کی رقم کا تعین ہی اس بنیاد پر ہوتا کہ کنبے میں کتنے ہاتھ کام کرنے والے ہیں۔نہ عورت کا سوال نہ بچے کا،پانچ سال سے لے کر اسی سال کی عمروں تک صرف ہاتھوں کی تعداد گنی جاتی ہے اور پیشگی طے پاتی ہے۔اگر مزدور ایک مالک سے تنگ آ کر دوسرے بھٹے پر جانا چاہے تو مالک اسے پیشگی کی پرچی بنا کر دے دیتا ہے دوسرا مالک پہلے کو پرچی کی رقم ادا کر کے مزدور کو بمعہ اہل و عیال خرید لیتا ہے۔'' (۱۱)

جہاں ہمیں بیانیہ میں بھٹہ خشت مالکان کے ظلم و زیادتی کا پتہ چلتا ہے وہاں ان مزدوروں کی عمروں اور کام کی نوعیت ومزدوری کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔مصنف نے بیانیہ کو اور اچھوتا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ مزدوروں کی عمروں کا تعین کرنا کوئی انوکھی بات نہ تھی مگر اس مزدوری کی شرائط اور پھر ان مزدوروں خواہ یہ عمر کے کسی بھی حصے میں تھے صرف اور صرف ان کے ہاتھوں میں کمی آنے پر بھٹہ کے مالک ان کے اُوپر مظالم ومصائب کا پہاڑ گرادیتے ۔جہاں لفظ پیشگی کا ذکر آتا ہے تو یہ وہ رقم ہوتی ہے کہ جو کوئی مزدور مزدوری سے پہلے وصول کر لیتا ہے۔اور پھر سال ہا سال اس رقم کے عوض پورے کا پورا خاندان مزدوری کرتا رہتا اس کے بعد اگر مزدور کی طرف سے اس ٹھیکہ میں کسی قسم کی کمی آتی ہے تو پھر مزدور کو سخت سزا کے لئے تیار رہنا پڑتا

۔مزدور اگر کسی مالک سے تنگ آجاتا تو اسے دوسرے مالک کے ہاں فروخت کر دیا جاتا اور پیشگی کی رقم پہلے مالک سے وصول کر لی جاتی۔یعنی ان کی زندگی کا یہ سفر انہیں غلام ابن غلام بننے پر مجبور کرتا رہتا۔اور یہ غلامی ساری زندگی کے لئے جاری رہتی اور اس طرح پورے کا پورا خاندان غلامی کی چکی میں ہمیشہ کے لیے پستا رہتا۔یعنی پیشگی کی رقم دگنی نہ ہوتو ڈیڈھ گناہ ضرور ہو چکی ہوتی بجائے کم ہونے کے یہ رقم بڑھتی رہتی پھر دوسری طرف بھٹہ مزدوران پڑھ ہونے کی وجہ سے کبھی بھی حساب کتاب پر توجہ نہ دے سکتے اور ہفتہ کے ہفتہ مالک سے خرچہ وصول کرتے رہتے جو رقم اصل میں انکی تنخواہ ہوتی جسے ہفتہ وار وصول کرتے وہ ایک طرح سے ان کے جسم میں غلامی کا زہر گھولنے کے برابر تھا کیونکہ یہ رقم وہ کھا پی کر اُڑا لیتے اور تنخواہ تو انہیں ملتی نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ پیشگی کی رقم بڑھ کر انہیں مستقل غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے پر مجبور کر دیتی جو تقریباً ہر بھٹہ خشت مالک اپنا طرۂ امتیاز سمجھتا تھا۔بیانیہ میں مصنف مصنف کسی ایک مزدور کی بات نہیں کرتا بلکہ دنیا میں موجود ہر اس شخص کی بات کرتا ہے کہ جو مزدوری کی چکی میں پھنسا ہے۔یہاں وہ بھٹہ مالک کے رویوں کو پوری دنیا کے روزگاروں کی بے حرمتی قرار دیتا ہے۔

بیانیہ تاریخی واقعات ،حادثات اور المیوں سے بھر پور ہونے کی وجہ سیہر اس تاریخی اہمیت کے واقعے کو مختلف حوالوں کے ساتھ بیان کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔مصنف واقعے کو محض واقعہ نہیں بلکہ ایک انکھوں دیکھی کہانی یا روداد کی شکل میں بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔جہاں مصنف کسانوں کے نجی حالات بیان کرتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ ان کے سیاسی رجحان،حکومت کے خلاف ان کے سالیی جلسے جلوسوں کو جن کے ذریعے عوام کو متحرک کرنا اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کو بھی بیانیہ کے دیگر مناظر میں جگہ دینے کی کوشش کرتا ہے وہ یہ بات باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ کسانوں کے لیڈران محض کسانوں کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں اصل میں یہ لیڈران جو بھی کرتے ہیں وہ اپنے لئے کرتے ہیں مصنف اسی کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ:

> ''یہ جو شیخ بنا ہوا ہے یہ سب میراثی اور جولاہے ہیں۔کوئی شیخ بن گیا یا کوئی انصاری ۔آرائیوں کو بھی اب جا کر عزت نصیب ہوئی ہے یہ سبزیاں بیچنے والے ہمارے سامنے زمین پر بیٹھتے تھے۔خیر یہ دوسری بات ہے۔یہ احمد علی کسان کمیٹی کا سرگرم کارکن ہے۔یہ کہتے ہیں ہم کسانوں کے حقوق کے لئے صرف جاٹ کی

ذات ہوتی ہے یہ دوسری بات ہے۔تمہیں پتا ہے احمد علی نام نہاد کسان کمیٹی کا
ورکر ہے۔'' (۱۲)

کسانوں کی زندگی کومختلف کرداروں کے ذریعے واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسان اس وقت کوئی اتنے اعلیٰ طبقہ سے نہیں تھے کیونکہ جب پاکستان آزاد ہوا تو جس کو موقع ملا اس نے خود قبضہ کیا یا پھر اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے جائیدادیں قبضہ میں کیں یعنی اس کے لئے کسی اعلیٰ قوم کی ضرورت نہ رہی بلکہ کوئی بھی کسان بن سکتا تھا۔یہاں خاص کر وہ علی احمد کا ذکر کرتا ہے کہ اس کا تعلق میراثی خاندان سے ہے اور میراثیوں سے کوئی واقف نہیں ان کسانوں کو عوام کے مسائل سے کیا سروکار یہ تو صرف اپنے پیسے بنانے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں۔مصنف ایوب خان کے دور کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسانوں نے اپنی جدوجہد کے لئے اور اپنے فائدے کے لئے کی نہ کہ چھوٹے کسانوں کی بھلائی کے لئے بڑے کسانوں نے ایوب خان حکومت کے خلاف جلسے جلوس نکالنے شروع کردیئے حالانکہ ان میں سے کچھ ان کے ساتھ اور کچھ ان کے خلاف میدان میں تھے۔یہاں بیانیہ کو مزید تجسس سے بھرپور بنانے کے لئے مصنف کہتا ہے کہ کسان ایک قسم کے ٹربل میکر ہیں اور ٹربل میکرز کے جہاں نقصانات ہیں وہاں ان کے کچھ فوائد بھی ہیں ہوسکتا ہے یہ حکومت سے کچھ مراعات حاصل کرنا چاہتے ہوں۔مصنف مزید کہتا ہے کہ اس وقت کے حالات کے مطابق کسانوں میں سے کچھ حکومت کے ساتھ اور کچھ اپوزیشن کے ساتھ تھے اور اصل میں وہ لوگ جو دونوں طرف ہوتے ہیں وہ زیادہ فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں رہتے ہیں۔ایوب خان کے دور حکومت میں کسانوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے اور کسان اس حکومت کے خلاف کیا اور کس وجہ سے جلسے اور جلوس نکال رہے تھے۔غریبوں کے ذریعے امیر ،امیر تر ہوتے گئے کیونکہ کمائی غریب کی تھی اور عیاشی امیر کرتے تھے یعنی پیسہ پیسے کی طرف آتا ہے۔

دوسری طرف بارڈر پر موجود مزارعوں سے ان کی زمینیں صدرایوب خان نے لے کر پاک فوج میں تقسیم کردی تھیں جس کے ردعمل کے طور پر کسانوں کی طرف سے ایک جلسہ منعقد کرنا اسی کا شاہسانہ تھا جس سے بڑے بڑے کسان لیڈروں نے خطاب کرنا تھا اس جلسے میں بے دخل کئے گئے مزارعوں کے بارے میں بھی نعرہ بلند کرنا تھا وہ اسی جلسے کا ایک جگہ ذکر کرتا ہے کہ:

''بیساکھی کے میلے لگ چکے تھے۔کسانوں کے گھروں میں سال بھر کے دانے آچکے تھے۔دالوں کی مٹکیاں آدھی پوری بھری تھیں اور ان کا خون گرم تھا اس موسم میں جلسے کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔منتظمین میں کسان تنظیم اور کسان کمیٹی دونوں کے لیڈر شامل تھے۔'' (۱۳)

مصنف نے دیگر تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ اس وقت کے موسم اور اس موسم کے مطابق اناج کو بھی اپنے بیانیہ کی زینت بنایا ہے جہاں بیساکھی کا ذکر کیا وہاں ساتھ ہی ساتھ کسانوں کے جلسے اور جلوسوں کا حال بھی بیان کردیا۔مصنف نے ہر اس چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو بیانیہ کا حصہ بنانے کی کوشش کی جس سے بیانیہ کی کہانی فنی لحاظ سے مضبوط اور با مقصد ہو۔وہ لیڈران کہ جنہیں اس جلسے سے خطاب کرنا تھاان کے چہروں پر خوشی کا نمایاں ہونا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ جیسے یہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے قریب ہیں۔بیانیہ پڑھنے والا قاری مصنف کی اس فنکاری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔مصنف لیڈران کی وہ محنت جو دن رات وہ ایک تقریر یاد کرنے کے لیے کرتے ہیں جسے انہیں جلسے میں کرنا ہوتی ہے اور اس ساری کی ساری محنت پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے کہ جب وہ جلسے کے عین شروع ہوتے ہی بیمار پڑ جاتا ہے۔دوسری طرف وہ اس منظر کو بھی دکھاتا ہے کہ کچھ کسان مزارعین کے حق میں بھوک ہڑتال کرتے ہیں اور سب مشکلات خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں۔ان تمام کوششوں کو ناول نگار نے انتہائی عمدگی کے ساتھ افسانوی انداز میں تجسس کا تڑکا لگا کر پیش کیا ہے۔اس کے بعد جلسے کے وقت عوام کا وہ جوش وخروش جو وہ اپنے لیڈران کی خوشی اور کامیابی کے لیے کرتے ہیں جیسے ڈھول باجے کا بجنا وغیرہ وغیرہ۔اس کے علاوہ ہر لیڈر کے لئے اس کے حامی اس کے جلسہ گاہ میں داخلے پر یا پھر جب وہ تقریر کے لئے سٹیج پر آتا تو اس وقت خوشی کے اظہار کے لیے ان کے حامی بھنگڑے ڈالتے اور ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنے لگتے۔مصنف نادار لوگ میں ایک جگہ سٹیج کا ماحول بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ننگے کھیتوں کے ایک وسیع میدان میں جلسہ لگا تھا ایک جانب چھوٹا سا شامیانہ نصب تھا جس کے نیچے لکڑی کے تختوں کا مختصر سا سٹیج کھڑا کیا گیا تھا۔سٹیج پر دریاں بچھا کر چار پانچ کرسیاں اور ایک میز رکھ دی گئی تھیں دونو جوان ایک اُونچے

سے ڈیسک پر رکھے ہوئے مائکروفون کی تاروں کو اُٹھا بچھا رہے تھے باقی کا
اجلاس کھلے آسمان تلے تھا۔'' (۱۴)

وقت، ماحول اور زمانے کے لحاظ سے ناول نگار نے ہر اس تاریخی منظر کی نشاندہی اپنے بیانیہ میں افسانوی انداز میں کردی ہے کہ جو اس وقت کے واقعات کے ساتھ جڑا تھا۔حقیقت اور تخیل کے فرق کو اس ناول کے بیانیہ میں واضح کردیا گیا ہے کیونکہ واقعات ہمیں وہ وقت اور مناظر بالکل آنکھوں کے سامنے ایک فیچر فلم کی طرح دکھاتا ہے اور جب ہم ان واقعات کے بیانیے پڑھتے ہیں تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل حقیقت پر مبنی ہیں اور تخیل سے کہیں دور کا بھی ان سے واسطہ نہیں یہاں اگر صرف اور صرف کسانوں کے جلسے کے لئے بنائے گئے سٹیج کا ہی جائزہ لیا جائے تو اُس وقت کے وہ مناظر اور کردار ایسے لگتے ہیں کہ جیسے ہم ذاتی طور پر ان کرداروں کا حصہ ہیں یا حصہ رہے ہوں اور یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہم اُس وقت عوام میں موجود ہوں اب بس صرف اور صرف مہمان گرامی اور بڑے لیڈران کا انتظار ہو رہا ہو۔سٹیج کا ماحول گرم ہے اور لیڈران کا جلسہ گاہ کی طرف بڑھنا اور لوگوں کا ان کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھنا کہ جیسے یہ لوگ ان کے لئے خاص مراعات لے کر آئے ہوں تھوڑی ہی دیر میں جلسہ شروع ہوتا ہے اور ہر ایک والہانہ انداز میں آکر اپنی تقریر جاڑ کر چلا جاتا ہے۔کئی لوگ بڑی اشتیاق سے اپنے لیڈران کو دیکھتے ہیں۔

یہ سارے واقعات اور مناظر صرف اور صرف مناظر ہی نہیں بلکہ ان کا اس دھرتی کے رہنے والے لوگوں کے ساتھ وہ تاریخی تعلق ہے کہ جسے کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ تمام واقعات ہماری زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جن کو یاد کرتے رہنے سے ہم میں وہ جوش اور جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اپنے ملک کے لئے کچھ کر گزریں۔بلکہ آسان الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاست کسی ایک فرد کا نام نہیں بلکہ اس کا تعلق ریاست کے تمام عوام کے ساتھ ہوتا ہے خواہ لیڈران کسی بھی پارٹی سے ہوں۔آگے جا کر عبداللہ حسین ایک اور جلسے کے سٹیج کا ذکر کرتا ہے جس پر اس وقت کے جانے پہچانے لیڈر مولانا بھاشانی تشریف فرما ہیں، لوگ ان کا استقبال تالیاں بجا بجا کر اور نعرے بازی کر کے اپنی محبت اور اور عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں۔مصنف کسانوں اور نیپ پارٹی میں کمیونسٹ طبقہ کے اثر و رسوخ اور کمیونسٹوں کا ان دونوں پارٹیوں میں سرائیت کرنا بیان کر رہے ہیں۔مولانا بھاشانی کا جلسہ میں تشریف لانے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ:

''حضرت مولانا بھاشانی صاحب تشریف لے آئے ہیں''۔ان کے استقبال کے
واسطے حاضرین کھڑے ہوجائیں،''

پھر دلدار بھٹی چیخ کر بولے،''''مولانا بھاشانی،۔

زندباد!'' جواب میں مجمع نے نعرہ لگایا۔

''ذرا زور سے۔'' دلدار بھٹی دہرا کر بولے۔''مولانا بھاشانی!''

''زندا باد!''

''غازی بنگال!''

''زندا باد''

''مجاہد انسانیت۔''

''زندابادـ'' (۱۵)

ہمیں اس بات کا زیادہ علم تو نہیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ وہ بھاشانی تھے جو کمیونسٹ مشہور تھے اور اچھی شخصیت کے مالک تھے اسی وجہ سے وہ بلند مرتبے والے لیڈر گنے جاتے تھے اور بیانیہ میں بھی مصنف نے ان کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے۔ ان کی اس وقت کی تقریر کو مصنف نے دو کرداروں کے ذریعے مکالمے میں بیان کیا ہے۔مصنف نے واقعات اور مناظر کو دکھانے کے لئے ہر ہر لمحے کو ہماری آنکھوں کے سامنے فکشن میں پیش کردیا جس سے تاریخی واقعات تو واقعات کرداروں کے ذریعے بھی اس وقت کے سیاسی لیڈران سے شناسائی کرانے کی بھر پور کوشش کی ہے جس کی اولین مثال مولانا بھاشانی ہیں جو کمیونسٹ ذہن کے مالک تو تھے ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ معاشی لحاظ سے مساوی حقوق کے لیے جدوجہد کرتے تھے انہی معاشی برابری کی بنیاد پر وہ کمیونسٹ بھی کہلائے کیونکہ ان کی تقریر ہی کی بدولت ان کے جلسوں اور جلوسوں میں عوام بڑی تعداد میں آتے تھے۔معاشی لحاظ سے ان کی تقریر اُس وقت کے مسائل خاص کر معاشی حالات کی ابتر صورتحال پر مبنی ہوتی تھی جس میں ان معاشی حالات کی ابتری کو دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کی جاتی تھیں۔

پیپلز پارٹی کا تاریخی ارتقائی سفر:

ہمیں نہیں معلوم کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے جلسوں میں کیا ہوتا ہوگا اور اس نے اتنی مقبولیت کس بنیاد پر حاصل کی اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہوں نے کتنی محنت کی اس کا اندازہ تاریخ کے علاوہ کسی بھی طرح سے سمجھنا ناممکن ہے لیکن ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی اس کی ارتقائی منازل کی تاریخ واضح کرنے کے لئے ہمارے تاریخی مصنفین حضرات نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بہت کچھ لکھا مگر عبداللہ حسین نے بطور ناول نگار جو کچھ فکشن کی زبان میں اس پارٹی کے ارتقاء کے بارے میں لکھا وہ مشکل ہی سے کسی تاریخ دان یا ناول نگار نے لکھا ہو۔ عبداللہ حسین نے ''نادار لوگ'' کے بیانیہ میں پارٹی کے ارتقاء کو بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جس کو قاری بھی خوشی کے ساتھ قبول کرتا ہے اور عوام میں بھی اس کو پزیرائی ملی۔

پیپلز پارٹی کی ارتقائی تاریخ اگر چہ انتہائی لمبی اور طویل ہے لیکن یہاں عبداللہ حسین نے اپنے اردو ناول نادار لوگ کے بیانیہ میں مکالموں سے کام لیتے ہوئے بیان کی ہے اسی طرح پاکستان کی تقریباً ایک چوتھائی تاریخ کو بھی بیان کردیا جس سے اس پارٹی کا ارتقاء اور اس کے لیڈر کی مقبولیت کو مختلف حیثیتوں سے دیکھا جا سکتا ہے کسی بھی پارٹی کی ابتداء عموماً غریب طبقہ ہی کے مسائل اور ان کے حل کے لئے تجاویز سے ہی ہوسکتا ہے یعنی کسی بھی پارٹی کی ابتداء مسائل کے حل اور عوام کے لئے وسائل کو بڑھانے ان کے وہ جائز کام کہ جو انفرادی یا اجتماعی نوعیت کے ہوں اور جن کا حل ناممکن ہوتو پارٹی اور ایک پلیٹ فارم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگ نئی پارٹی یا پریشر گروپ بنانے کے لئے سرگرم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے فلاحی اور دیگر ضروریات یا مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے اسی طرح اس پارٹی کا قیام بھی عمل میں آیا۔ نادار لوگ میں مصنف ایک جگہ لکھتا ہے:

> ''اگر آپ تین گھنٹے کے نوٹس پر چار دیگوں، دس ریہڑوں اور پانچ سو جھنڈوں اور بینروں کا مطالبہ کریں گے تو ہم کہاں سے پیدا کرکے دیں گے۔ اسی طرح ہماری کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ بندے جلسے پر بھیجیں۔'' (۱۶)

پارٹی کا نام لئے بغیر ناول نادار لوگ کے بیانیہ میں جلسے اور جلوسوں کے متعلق ذکر اور بیان

مصنف نے پتہ نہیں کس وجہ سے کیا ہے لیکن ایک بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ بیانیہ میں جو بھی بحث کسی گروپ کے لیے کی گئی ہے ان کا مقصد پارٹی کے ارتقاء کو بیان کرنا ہے مصنف نے اعجاز جو کہ سیکریٹری ہے اپنے علاقے کی یونین کا اور بات کرنا چاہتا ہے اپنے اسسٹنٹ سیکریٹری کے ذریعے چوہدری انتصار صاحب سے حکومت کے خلاف کسی جلسے سے متعلق یہ جلسہ غریب اور کسان طبقے کی مشکلات اور پریشانیوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے جس کو کامیاب کرانے اور اپنی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ براہ ہونے کے لئے سر توڑ کوششیں کی جائیں جس میں پارٹی ورکروں اور دیگر افراد کو جلسے سے متعلق ہدایات دی جائیں کہ جلسہ کو کس طرح کامیاب بنایا جاسکتا ہے پھر ساتھ ہی جھنڈوں کی ڈیمانڈ اور بینروں وغیرہ کا تقاضا کیا جاتا ہے تاکہ جلسہ گاہ کو سجایا جائے مگر وقت کی کمی کی وجہ سے دونوں کردار اپنی اپنی مجبوری بیان کرتے ہیں یہ وہ تمام ضروری چیزیں ہوتی ہیں کہ جن کی وجہ سے کسی بھی سیاسی پارٹی کو پہچانا اور عوام میں مقبول کرانے کی سیڑھی ہوتی ہے۔اسے پارٹی کی علاقائی سطح پر اکٹھ کہتے ہیں اور اسی طرح مرکزی سطح پر اسی نوعیت کا بڑے پیمانے پر اکٹھ ہوتا ہے اور یونین اپنے ورکروں کے کام اپنی یونین کی حکومت آنے کے دوران کرتی ہے اور ان کے انتخابات بھی یونین ہی کی سطح پر ہوتے ہیں اور وہی یونینز مرکزی سطح پر ہونے والے جلسے اور جلوسوں میں ملکر حصہ لیتے ہیں۔بعض اوقات لیڈروں کی سخت پالیسی اور ورکروں کے ساتھ رویوں کو بھی مصنف نے اپنے بیانیہ کا حصہ بنایا ہے۔جیسے مصنف لکھتا ہے کہ:

> ''بیس پچیس منٹ میں اعجاز نے انہیں فارغ کردیا۔چلو اب جاؤ تم کو جو بتا دیا گیا ہے اس پر عمل کرو۔چلو اب جاؤ۔میرا سارا دن تمہارے لئے وقف نہیں ہے۔کسی اور کا کام بھی ہونے دو۔'' (۱۷)

ہمیں نہیں معلوم کہ دوسرے لیڈران بھی اعجاز کی طرح سلوک روا رکھتے ہونگے اپنے ورکروں کے ساتھ یا نہیں جیسا کہ علاقائی یونین سیکریٹری کے عہدے پر اپنی خدمات انجام دے رہا تھا لیکن وسائل کی کمی اور سائل کی زیادتی کی وجہ سے اعجاز تنگ ہوگر ورکروں کے ساتھ غیر محتاط رویہ روا رکھے ہوئے تھا جس کی وجہ سے بہت سے ورکران سے ناراض بھی تھے۔اس قسم کے عہدے پر خدمات کی وجہ سے وقت نکالنا سب کے لئے مشکل کام تھا اس لئے تھوڑا تھوڑا وقت ہر ایک کو دے کر ان کے مسائل سننے پڑتے ہیں پھر ایک وقت میں سب کو خوش رکھنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ یونین کی سطح پر محنت اور مشقت کو بیانیہ میں انتہائی

خوبصورت انداز میں بیان کر کے دیگر ناول نگاروں کے بیانیوں کو ایک درجہ پیچھے دھکیل دیا گیا ہے جیسے ایک فیکٹری ورکر کو چوری کے الزام میں پکڑ کر نوکری سے نکال دیا جاتا ہے اور پھر وہ اپنی یونین سیکریٹری کے پاس حاضر ہوکر اپنا ماجرہ سناتا ہے کہ:

''ملک جی،'' وہ اعجاز کی جانب جھک کر بولا،''اس غریب کا کام اٹکا ہوا ہے۔''

''کیا ہے؟''اعجاز نے تھکے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

''پیر کے دن!پیر کو کتنے دن گزر گئے ہیں،ایک ،دو،تین،چار،پانچ۔ان پانچ دنوں میں کتنے معاملے ہوگئے ہیں۔مجھے کوئی یاد رہتے ہیں؟تم بھی عجیب آدمی ہو۔قصہ بتاؤ کیا ہے؟''

وہ صابرائینڈ سنز والا معاملہ ہے۔''

'تفصیل کیا ہے۔''

'اس غریب پر چوری کا الزام لگا کر نکال دیا ہے ایک پیسہ نہیں دیا۔پندرہ دن کی تنخواہ ایک مہینے کا نوٹس،سب کچھ دینے سے انکاری ہیں۔'' (۱۸)

یونین کے معاملات اور ان کے مسائل اپنی جگہ مگر یہاں اصل میں بیانیہ کی کہانی جس چیز کو بیان کر رہی ہے وہ ایک ایسی پارٹی کا ارتقائی سفر ہے کہ جس نے اپنے لیڈر کی عوام میں مقبولیت کی وجہ سے آج بھی اپنے آپ کو زندہ رکھا ہوا ہے۔اسی طرح شروع شروع میں کسی بھی سیاسی پارٹی کو عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے بہت سی مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہی مسئلہ کسی نہ کسی حد تک پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ان تمام حالات کے باوجود لیڈر نے پارٹی کو ترقی کی راہ پر چلانے کے لئے بہت جدوجہد کی۔انہی چھوٹے چھوٹے مسائل کو حل کرنے کے بعد یونین اس قابل ہو جاتی ہے کہ اپنے علاقے کے بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کے لئے اپنی اوپر کی قیادت سے رابطے کرنے پڑتے ہیں۔اور اس طرح یہ یونین اس قابل ہو جاتی ہے کہ اپنے علاقے کی ترقی کے لئے بھی اپنی پارٹی کی اعلیٰ قیادت سے مسلسل رابطے میں رہیں۔مصنف کہتا ہے کہ اس سطح پر آکر جدوجہد کرنا یقینی کامیابی اور عوام میں ساکھ کو بہتر بنانے کا موقع ہوتا ہے۔بڑے جلسے اور جلوسوں کے موسم بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔پارٹی کارکنان نے

اپنے لیڈران کو خوش کرنے اور ان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ان تھک کوششیں اور محنت سے کام لیا نئی پارٹی کے منشور نے اعجاز کے ضمیر کو بیدار کیا اس پارٹی کا بنیادی نعرہ غریبوں، ناداروں، مزدوروں کی طرف داری تھا۔اس وقت کے دس برس سے برا جمان سابق فوجی صدر کے خلاف تحریک چلی جس کی جہ سے اسے دستبردار ہونا پڑا اور عنان حکومت ایک فوجی جرنیل کے حوالے کردی تھی۔ جو کہ آزاد الیکشن کا وعدہ کر چکا تھا۔ اصل میں یہ نئی پارٹی پاکستان پیپلز پارٹی تھی جس کے لیڈر نے آکر عوام میں اپنی پارٹی کی جڑیں مضبوط کیں۔مصنف پارٹی سے دلی لگاؤ کو ایک جگہ ذکر کرتے ہیں کہ:

''وہ پارٹی کے بانی لیڈر کا دیوانگی کی حد تک شیدائی تھا۔'' (۱۹)

پارٹی پر جان نچھاور کرنے کے لیے تب ہی عوام تیار ہوتے ہیں جب انہیں پارٹی کے منشور یا پھر اس کے لیڈران کا عوامی مسائل کو حل کرنے کی طرف خصوصی توجہ ہو۔لیڈر پارٹی کا اساسہ ہوتے ہیں اور پھر پارٹی ورکرز کہ جو اپنی پارٹی کے لئے مر مٹنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔یہ ساری محبت اور پارٹی سے وفاداری لیڈر کی اپنے ورکروں اور عوام کے ساتھ وہ وعدے جو وہ اپنی تقریروں ،مختلف کانفرنسوں میں کرتے ہیں۔کیونکہ کہ جب لیڈر عوام کے دل کی بات کرتے ہیں تو پھر عوام ان کے پیچھے اپنی تمام توانائیاں صرف کرنے سے دریغ نہیں کرتے یہ سب کچھ اپنی پارٹی کے ساتھ مخلص ہونے کا ثبوت یہی چیزیں پارٹی کو مقبول بناتی ہیں جس کی روشن مثال پاکستان پیپلز پارٹی ہے۔جس نے اتنی قلیل مدت میں اپنی جڑیں عوام میں مضبوط کی ہوں مصنف نے پارٹی کے تاریخی ارتقائی سفر کے دوران یونینز کے ذریعے کارکنان کی جدوجہد کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے اس پارٹی کا ارتقائی سفر یقیناً ایک دلچسپ تاریخی واقعہ ہے جو اپنی داستان کے ساتھ منسلک دکھائی دیتا ہے ۔ویسے تو اس قسم کے تاریخی واقعات بہت سی ادبی اور تاریخی کتابوں میں میسر آسکتے ہیں مگر کسی سیاسی پارٹی کی تاریخ کو فکشن میں بیان کرنے والے بہت ہی کم ناول نگار ہونگے جن میں سے عبداللہ حسین بھی ایک ایسے ہی ناول نگار ہے جس نے اس قسم کی منفرد تاریخ بیان کر دی۔فنی اعتبار سے ناول کا بیانیہ مکالموں کے تڑکا لگنے کے بعد بامقصد،معنی خیز اور دلچسپی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

بیانیہ جہاں پارٹی کی تاریخ کو قصہ گوئی کے افسانوی انداز میں بیان کرتا ہے وہاں ان میں مزید دلچسپی اور تجسس کے لئے ایسے باریک مگر دل موہ لینے والے چھوٹے چھوٹے تاریخی اہمیت کے واقعات کا

بھی احاطہ کرتا ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری کے تجسس اور شوق میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ان چھوٹے چھوٹے قصوں کو اگر دیکھا جائے تو یہی قصے بیانیہ کو خوشنما اور حقیقت پسندی کے قریب لانے میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جیسے جلسے کے حوالے سے مصنف نے پارٹی رہنماؤں کا ذکر کیا ہے وہاں تاریخی مقامات کو بھی اپنے بیانیہ میں شامل کیا ہے چونکہ اس وقت یہ جلسے پاکستان میں مختلف مقامات پر ہو رہے تھے ان میں لاہور کا بادامی باغ جسے پاکستان میں ایک اہم تاریخی مقام کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے اس مقام پر بھی جلسے کی کارروائی کا ذکر ناول ''نادار لوگ'' میں ملتا ہے۔مصنف نے اس وقت کے جلسوں اور جلوسوں کے دوران خواتین کے ڈانس کا بھی کسی حد تک ذکر کیا ہے۔ حالانکہ اس وقت کی پارٹی کہ جس کا ذکر مصنف نام لئے بغیر کرتا ہے آج خواتین کے ڈانس کے حوالے سے اُس پارٹی کی خوبخو تصوری ہمیں بعد میں بننے والی نئی پارٹی میں دکھائی دیتی ہے (پاکستان تحریک انصاف)۔خواتین کے اس کردار کو مصنف ''نادار لوگ'' میں ایک مقام پر ذکر کرتے ہیں کہ:

> ''عورتوں کو آزادی دے کر سٹیج پر نچوانا بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا یہی انکا عمل ہے تو ہوتا ہے کہ منہ کھولنے سے پہلے بندہ اپنی جیب کھولے۔کیا اس نے اپنی جاگیر مزارعوں میں تقسیم کی ہے؟صرف لباس تبدیل کرنے سے کیا ہوتا ہے۔'' (۲۰)

پارٹی جیسے جیسے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی وہاں ساتھ ہی ساتھ اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا مصنف نام لئے بغیر پارٹی کے جلسوں میں خواتین کے ناچ گانے پر ہونے والی تنقید کو دو کرداروں کے نیم مکالمانہ افسانوی انداز میں بیان کرتا ہے۔اگر دیکھا جائے تو پیپلز پارٹی کے جلسے جو ماضی میں اس کے لیڈر کی سرکردگی میں ہوتے تھے مصنف نے اس کی تنقیدزدہ حالت کو بھی کھول کر رکھ دیا کیونکہ ایسا ہونہیں سکتا کہ تعریف تو کی جائے مگر تنقید سے انکھیں چرائی جائیں یہی مصنف کی غیر جانبداری کو ظاہر کرتی ہے۔سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈران کو تو سیاسی میدان میں بہت زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی بنا پر سیاسی پارٹیاں مقبولیت کے لحاظ سے عوام میں نشیب و فراز سے اپنا مقام کھوتی اور حاصل کرتی رہتی ہیں یہاں پر بھی سیاسی میدان میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لئے مختلف سیاستدانوں کو آپس میں لڑا کر فائدہ اُٹھاتے ہیں۔پارٹی لیڈر کا حال بتاتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ لوگ گھنٹوں لیڈران کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور

وہ جلسہ گاہ آ بھی جاتے ہیں مگر کیا ان لیڈران کو عوام سے محبت بھی ہے اور وہ ان کی اس محبت میں ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں اس کو مصنف نے ایک جگہ بیانیہ میں کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''لاکھوں کا یہ مجمع بازو اوپر اٹھائے نعرے پہ نعرہ لگا رہا تھا فضاء میں ہزار ہا آوازوں کی مجموعی ہیبت پھیلی تھی۔ یہ لوگ اپنے محبوب لیڈر کو دیکھنے آئے تھے جسے ایک فوجی ڈکٹیٹر نے جیل میں ڈال دیا تھا، اور جب وہ ڈکٹیٹر دستبردار ہوا تو دوسرے فوجی ڈکٹیٹر نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ رہا ہونے کے بعد ان کا لیڈر پہلی بار اس شہر میں آیا تھا۔''(۲۱)

یہاں بیانیہ میں فوجی ڈکٹیٹر کا ذکر کرنا غالباً مصنف کا پارٹی کے لیڈر پر ظلم و زیادتی اور سیاسی و جمہوری آزادی کو صلب کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ یہاں لیڈر اور ایک فوجی ڈکٹیٹر کا ذکر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس حصہ میں بھی ناول نگار کی فنکاری اُبھر کر سامنے آئی ہے جو ایک اچھے افسانوی بیانیہ کی بہترین مثال کہی جا سکتی ہے پھر ایک اور بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ سیاسی ماحول گرمانے، پارٹی کو عوام میں پذیرائی بخشنے کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنے عوام میں اپنی اور پارٹی کی سیاسی ساکھ کو پروان چڑھانے اور ایک حد تک مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا کرنے والے لیڈر کا عوام میں نفوذ اسکا مقصد ہو سکتا ہے۔ مصنف نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لیڈر کا نام لئے بغیر ہی اس کی وہ تمام صفات بیان کر ڈالیں۔ جس سے اس لیڈر کا نام لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے اس کا جواب مصنف ہی دے سکتا ہے۔ جلسے کامیاب ہو رہے ہیں شہر شہر گاؤں گاؤں پارٹی اور پارٹی کے لیڈران کے چرچے ہیں لیڈر کی حکومتی قید سے رہائی پانے کے بعد اب پارٹی کا مورال بلند دکھائی دے رہا ہے اور عوام کی ہمدردیوں میں اضافہ ہو رہا ہے پارٹی قیادت اب عوامی طاقت کے ذریعے سے حکومت وقت سے ٹکر لینے کی پوزیشن میں دکھائی دے رہی تھی مصنف پارٹی لیڈر کے بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

''اس نے نہ پینٹ کوٹ اور نہ ٹائی لگا رکھی تھی، نہ شیروانی اور جناح کیپ پہنی ہوئی تھی۔ ملیشے کے رنگ کی معمولی شلوار قمیض اُس کے زیب تن تھی اور پاؤں

میں چپلی تھی۔اس کی قمیض کے کف کھلے تھے اور جب وہ بازو اوپر اٹھاتا تو
آستینیں کہنیوں تک ڈھلک جاتیں اور باہیں ننگی ہوجاتیں۔غریب لوگوں کے
اس جم غفیر کے سامنے سٹیج پر کھڑا ہوا وہ ایک غریب آدمی نظر آرہا تھا۔''(۲۲)

محبوب لیڈر کو سننے والے افراد ان کی پوری تقریر میں صرف ایک جملے کی وجہ سے غیرت اور حمیت کے جذبات تلے دکھائی نہیں دے رہے تھے وہ مارے جوش کے اس ایک جملہ ''اگر میرے اندر غیرت ہے تو میں کیا کروں'' نے عوام کے جذبات کو آگ کی طرح زندہ کردیا جس کی وجہ سے جوش و جذبہ بڑھا اور ہجوم اچھل پڑا تالیوں اور شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔مصنف جلسے کے دوران لگائے جانے والے نعروں کو افسانے کے انداز میں بیان کرکے غریب عوام کی اپنے لیڈر سے محبت اور والہانہ عقیدت کے اظہار کو دکھانا چاہتا ہے یعنی لیڈر نے یہ جملہ استعمال کیا ہی اس لئے کہ عوام کے جذبات اور احساسات کو جنجوڑا جائے اور ان میں لیڈر کی محبت جو پہلے تو تھی ہی لیکن مزید بڑھ جائے اور ہوا بھی بالکل ایسا ہی کہ اسی ایک نعرہ نے لیڈر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔مجمع میں اس وقت ہو کا عالم تھا جب لیڈر نے یہ کہا:

''ایک شخص ہے شیر علی،'' وہ کہہ رہا تھا۔'' اسے نوابزادہ شیر علی کہتے ہیں۔اُس کو
حکومت نے میری جگہ پر وزیر خارجہ مقرر کیا ہے۔اس شخص کو خارجہ پالیسی کا کیا
علم ہے؟''
کوئی علم نہیں ۔۔۔۔۔۔''مجمع دھاڑا''۔
چل شیر علی لیڈر نے انگلی ہوا میں اٹھائی، پھر جھٹکے سے گرائی نیچے
اُتر۔۔۔۔اوشیر علی نیچے اُتر۔'' (۲۳)

لیڈر کا ہمیشہ عوام کے مسائل کو اُبھارنے اور ان کے حل کے لیے سچے جھوٹے وعدے کرتا رہتا ہے جس کا مقصد عوام کی ہمدردیوں کو سمیٹنا اور ان کے دلوں پر حکمرانی کرنا ہے لازمی نہیں کہ وہ اپنے مقاصد میں سو فیصد کامیاب رہے مگر عوام کی تائید بحرحال لیڈر حاصل کر لیتے ہیں۔مصنف نے بھی مقرر کی اس خاص بات کا ذکر کیا ہے جو ایک لیڈر اپنی قوم کے لئے دل میں رکھتا ہے۔اس بیانیہ میں مصنف نے بھی یہی کوشش کی

ہے کہ اس چھوٹے سے چھوٹے لمحے کو واقعے سے علیحدہ نہ کیا جائے اور کسی نہ کسی طرح اس میں دلچسپی برقرار رکھی جائے یہی اصل میں کہانی اور بیانیہ کی جان ہوتی ہے۔لیڈر کے منہ سے اپنی مقصد کی بات نکالنے کے بعد عوام اپنی خوشی یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ لیڈر کا شکریہ ادا کرنے کا اظہار کئی طریقوں سے کرتے ہیں۔مصنف ان اظہار کے طریقوں کو کئی انداز دے کر بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یعنی کبھی تو عوام اپنے لیڈر کے لئے قہقہے اور کبھی اس کے حق میں نعرے بازی کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر تالیاں بجا کر اپنے لیڈروں سے یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ان طریقوں کے علاوہ کبھی لیڈر کی بات پر واہ واہ کے ذریعے انہیں اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہیں یہی صورتحال اس بیانیہ میں پیپلز پارٹی کے لیڈر کے ساتھ بھی ہے۔اس لیڈر کے ایک ہی جملے ''میرے اندر غیرت ہے تو میں کیا کروں؟'' کے لفظ نے اس لیڈر کو عوام میں متعارف کرایہ بلکہ یوں کہنا بجا نہ ہوگا کہ اس لیڈر کو اسی جملے نے مشہور کردیا۔اس ایک جملے نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ موجودہ دور میں بھی وہ پارٹی پاکستان کے کم ہ بیش چاروں صوبوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور سیاسی میدان میں ہمیشہ اپنی حیثیت کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

سانحہ سقوط ڈھاکہ:

''ناول نادار لوگ میں جہاں کئی دوسرے واقعات کو بیان کیا گیا ہے وہاں ان تاریخی واقعات کے ضمن میں ان مسائل کو بھی اور ان نقصانات کا بھی ذکر کیا کر دیا گیا ہے۔کیونکہ مصنف اپنی فنی خوبیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر اس واقعہ کو بیان کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے کہ جس کا تعلق تاریخ یا تاریخی واقعات سے جڑا ہوا ہو۔تاریخی واقعات کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے اور انکی اہمیت بھی کم یا زیادہ ہو سکتی ہے مگر کچھ واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جو قدرے کم اہمیت کے حامل ہونے کے باوجود ایک اچھا ناول نگار اپنی فنی مہارت اور تکنیک کے ذریعے ان میں نکھار پیدا کرنے کے موقع کو ضایا اور اس طرح یہ واقعات انتہائی اہمیت کے حامل واقعات بن جاتے ہیں۔لیکن یہ کام ہر ناول نگار نہیں کرسکتا بہت کم ناول نگاروں میں یہ خوبی ہوسکتی ہے۔زیر بحث بیانیہ اس کی مثال آپ ہے۔اس افسانوی بیانیہ کا مقصد میرے نزدیک مصنف کا محض صفحے کالے کرنا نہیں بلکہ ان واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے انداز میں قاری تک سچ وصداقت کے ساتھ پہنچانا ہے کہ جس سے حق و باطل کا فرق واضح کیا جا سکے۔تقریباً ایسا ہی ہوا ہے اس

بیانیہ میں کیونکہ یہ محض واقعہ ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے فراموش کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یہاں مصنف جس واقعے کا ذکر کر رہا ہے وہ موجودہ بنگلا دیش کا پاکستان سے الگ ہونے کا تاریخی واقعہ ہے۔ جسے بیان کرنے کو تو بہت سے تاریخ دانوں نے اپنے اپنے انداز میں بیان کردیا مگر افسانوی انداز میں اس واقعہ کو بیانیہ کی شکل دیکر پیش کرنا عبداللہ حسین کا انوکھا کام ہے یا پھر مستنصر حسین تارڑ کا جس نے اسے فکشن میں بیان کیا ہے بیانیہ میں قصہ گوئی سے بھی کام لیا گیا ہے مگر جہاں ضروری سمجھا وہاں مکالموں کا استعمال بھی خوب مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے باقی بیانیوں کی طرح اس بیانیہ کا معنوی انداز بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔

مصنف سقوط ڈھاکہ کے اسباب و وجوہات میں جہاں لسانی انتشار کا ذکر کرتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ وہ اس سانحے میں سیاسی افراتفری اور مختلف پارٹی لیڈروں کی اقتدار کے لیے رسہ کشی کو بھی سبب بتاتا ہے۔ ان کی اس بات سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے مگر اتنا ضرور ہے کہ اس کی بات میں کسی حد تک سچائی کا عنصر ضرور دکھائی دیتا ہے۔ آگے چل کر بیانیہ وہ تمام حالات جسے قاری تحیل تو نہیں کہ سکتا اور نہ ہی یہ بیانیہ حقیقت سے دور دکھائی دیتا ہے مگر پھر کیوں اس بیانیہ پر اعتبار اور بھروسہ نہ کیا جائے اور اسے حقیقت کے قریب تر مانا جائے۔ مصنف اپنی تخلیقی خوبیوں کو استعمال کرتا ہوا اس سانحہ سے منسلک ان تمام لمحات جن کے دوران کئی المیوں نے جنم لیا کے مناظر کو بیان کرتا ہے جیسے ایسے ایک اور جگہ پر وہ لکھتا ہے کہ:

> ''ورکروں میں بے چینی پھیل رہی تھی کسی کا کوئی کام نہ ہو رہا تھا ملک کے دونوں بازوؤں کے سیاسی جھگڑے گھمبیر شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ یہ بھی افواہ تھی کہ فوج تصفیہ ہونے نہیں دے رہی کیونکہ بنگالی حکومت سے احکام لینے پر تیار نہیں۔ ان حالات میں پارٹی کے لیڈروں نے اپنے ورکروں کو خاص طور پر طلباء کو سڑکوں پہ نکال لانے کی دھمکی دے دی تھی۔'' (۲۴)

واقعات کو پرکھنے کا زاویہ کوئی بھی اختیار کیا جائے اس سے فرق کوئی نہیں پڑتا مگر اس واقعہ سے متعلق مناظر و حالات ضرور قدرے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کا واقعہ کم وبیش بہت سے مصنفین نے اپنی تاریخ کی کتب میں لکھا ہوا ہے لیکن جن مسائل، حالات کا ذکر جس باریک بینی کے ساتھ مصنف نے اپنے

ناول میں کیا ہے اس سے ایک فیچر فلم کی صورت میں سکرین پر نمودار ہو کر ہمیں جھنجوڑتا ہے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب پاکستان کے دونوں بازو مشرقی اور مغربی سیاسی اور لسانی کشمکش میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف ورکروں میں ایک ہیجان کی سی کیفیت پائی جاتی تھی، ہر طرف ورکر تو ورکر لیڈرز بھی بے چین اور اکتاہٹ کے شکار دکھائی دے رہے تھے جس کی وجہ سے جہاں لیڈر خود پریشان تھے ورکروں میں بھی بے چینی دیکھنے کو ملتی تھی ملک کے دونوں حصوں میں ہر طرف انتشار اور افراتفری کا عالم تھا۔حکومت کی گرفت مغربی حصے پر کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔مغربی حصے کے عوام کی اکثریت بنگالی ہونے کی وجہ سے حکومت کے احکامات کو پس پشت ڈال رہی تھی اور ایک سیاسی پارٹی کے ایماء پر اپنے لئے علیحدہ ریاست کی کوششوں میں مصروف دکھائی دے رہی تھی اور اس کی خاطر سب کچھ کرگزرنے کے لیے تیار تھے جبکہ اس کے برعکس مشرقی حصے کے عوام اس قسم کی لسانی بنیادوں پر علیحدگی کی کوششوں کے سخت خلاف تھے اسی کشمکش کے دوران افواہیں بھی اپنا کام دکھا رہی تھیں۔ مصنف نے فوج پر لگائے گئے الزامات کو بھی سیاق و سباق کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیا۔فوج کے حوالے سے یہ بات کہی جا رہی تھی کہ اصل تصفیہ نہ ہونے دینے والی قوت فوج ہے جس کی وجہ سے دونوں حصوں میں سیاسی تناؤ بڑھتا جا رہا ہے فوج پر انگلی اُٹھانے کی وجہ سے فوجی قیادت نے بدنامی کی وجہ سے ایکشن لیا جس کی کامیابی اور ناکامی کا اندازہ عوام بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔اس سیاسی تناؤ نے آگے جا کر نئی اور خطرناک صورت اختیار کرلی اور اس طرح عوام میں افراتفری نے جنم لیا اور ایک غیر ملک کو پاکستان کے اندرونی معاملات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع مل گیا جو اس کی دلی حسرت تھی۔ہندو شروع ہی سے تقسیم ہند کے خلاف تھے جس کا بدلہ وہ ہر قیمت پر لینا چاہتے تھے جس میں وہ کامیاب رہے۔ پڑوسی ملک کے اندرونی معاملات دخل اندازی اور بنگلہ دیش کا ساتھ دینے کی وجہ سے حالات حکومت کے قابو سے باہر ہوگئے۔دونوں بازوؤں کی سیاسی قیادت میں رسہ کشی کی کیفیت نے جنم لیا۔سیاسی پارہ بلندی کی سطح کو چھو رہا تھا اس دوران آرمی بھی سرگرم دکھائی دے رہی تھی جن کی وجہ سے مشرقی حصے میں فوج اپنی پوزیشن سنبھال کر ایکشن شروع کر چکی تھی جبکہ دوسری طرف جلسوں اور جلوسوں کے لئے تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔مصنف ان جلسوں کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

''شہر کے ہر کونے سے مختلف جلوس،ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ ناچتے گاتے

ہوئے مردوں عورتوں کے ہمراہ مانگے تانگے ہوئے ٹرکوں، ریہڑوں گدھا
گاڑیوں، رکشاؤں اور تانگوں کے ساتھ ہی سمت کو چلے جا رہے تھے۔'' (۶۵)

افسانوی بیانیہ کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ اس میں واقعہ چاہے کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو قاری کو اسے پڑھنے میں کسی پریشانی اور اکتاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ کیونکہ اس طرح کے بیانیہ میں قاری کے تجسس کا مواد زیادہ ہونے کی وجہ سے آگے بڑھنے اور کیا ہونے والا ہے کی دھن چین لینے نہیں دیتی۔ مصنف ایک طرف فوج کے ایکشنز کو دکھا رہا ہے تو دوسری طرف وہ جلسوں اور جلوسوں کے مناظر کو بھی ساتھ لیکر چلتا ہے یہاں مصنف کی فنکاری دیکھی جا سکتی ہے کہ جس کے ذریعے ایک ناول نگار بیانیہ کو جتنا چاہے طویل کردے لیکن اکتاہٹ کا شائبہ تک نہ ہونے دے۔ اس دوران جلسوں کا مرکز ''گول باغ'' جو کہ بعد میں ناصر باغ کے نام سے موصوم ہوا کی طرف تھا۔ مصنف اس اہم اور تاریخی مقام ناصر باغ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

''گول باغ کے اندر جس کا نام ناصر باغ رکھا جانے والا تھا لوگوں کی ایسی بھیڑ
تھی جیسی صبح سویرے منڈی میں ہوتی ہے۔'' (۶۲)

ہمیں معلوم نہیں کہ اس وقت جلسوں اور جلوسوں میں عوام کی رائے کیا تھی مگر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جو تاریخی مناظر مصنف نے بیان کیے ہیں اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا جس کی وجہ سے مصنف نے ان لمحات کو ایک ایک کرکے تفصیل سے بیان کردیا اور صرف یہی نہیں بلکہ ناصر باغ جو کہ ایک تاریخی مقام کی حیثیت سے اب بھی جانا پہچانا جاتا ہے اس کا ذکر کرکے اس مقام کی شہرت میں مزید اضافہ کردیا۔ جلسہ جو کہ اپنی اہمیت کے حوالے سے لوگوں کی توجہ کا باعث رہا اسکی خاص وجہ اس جلسہ سے ایک ایسے لیڈر نے خطاب کرنا تھا کہ جو عوام میں اور خاص کر ان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ جس کا نام مصنف نے نہیں لیا مگر اسے با آسانی پہچانا جا سکتا ہے کہ وہ لیڈر کون تھا کہ جسے عوام میں اتنی پزیرائی ملی اور عوام انکا ایک خطاب سننے کے لئے بے چین دکھائی دے رہی تھی۔

حالات کی سنگینی اور دونوں بازوؤں میں سیاسی حالات یکسر بدلنے کی وجہ سے فوج میں بھی تبادلے اور ٹرانسفرز کی لہر بیانیہ کو ایک نیا افسانوی رنگ دے رہی ہے جسے مصنف اپنے بیانیہ میں کچھ ان الفاظ میں

بیان کرتا ہے:

''اگلے روز شام کے وقت اچانک سرفراز گھر آپہنچا۔اس نے بتایا کہ اس کی پوسٹنگ مشرقی پاکستان کی ہوگئی ہے۔چھ ماہ اس کی رجمنٹ مشرقی پاکستان جا چکی تھی۔مگر اس وقت سرفراز کی پوسٹنگ عارضی طور پر ایک دوسری رجمنٹ میں کردی تھی۔اب افسروں کی کمی کی وجہ سے اسے اپنی پیرنٹ رجمنٹ میں واپس آنے کا بلاوا آگیا ہے۔'' (٦٧)

مشرقی پاکستان میں پاک فوج کے ایکشن لینے اورآرمی افساران کے تبادلے کے اسباب مشرقی پاکستان کا De stable ہونا،انتشار، لسانی تعصب اوراس سیاسی پارٹی کے ورکروں کی بدمزگی تھے۔مشرقی پاکستان کا انتشار مشرقی حصے میں فوج اور پاکستان کے خلاف لسانی بنیادوں پر پروپیگینڈا مہم عروج پر پہنچ چکی تھی ملک کا سیاسی پارہ مسلسل بڑھ رہا تھاسرفراز پاکستان آرمی میں خاص عہدے پر خدمات انجام دے رہا تھا اس کا تبادلہ بھی مشرقی پاکستان میں کردیا گیا جو اسی بات کا ثبوت ہے۔ہلچل بنیادی طور پر ایک گھناؤنی سازش تھی جس کی وجہ سے ملک دوٹکڑے ہوا۔ملک توڑنے کی یہ تمام سازشیں کامیاب ہوئیں لیکن ملک کو یکجا رکھنے کی تمام کوششیں بے سود رہیں۔آسان الفاظ میں یہ کہاجا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش کے بننے میں بھارتی حکومت اور بھارتی فوج کا خون پسینہ شامل ہے جس کا وہ آج بھی اقرار کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔

سرفراز کی ٹرانسفر سے قبل ہی مشرقی پاکستان کے حالات خاصے خراب ہو چکے تھے سرفراز کا دوست جو دہشت گردوں کے حملے میں زخمی ہو چکا تھا سرفراز کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''خوش قسمت ہو یار جو ایکشن سے تھوڑی دیر ہی پہلے پہنچے۔''

سرفراز ہلکا سا مسکرا کر چھپ ہو رہا۔وہ سوچ رہا تھا کہ وہ خوش قسمت ہے کہ بدقسمت؟

''مجھے دس مہینے ہو چلے ہیں سارا سین دیکھ چکا ہوں۔فرسٹ ایکٹ سے لے کر ڈراپ سین تک'' کیپٹن عمران پھر بولا''اینی نیوز اباؤٹ کیپٹن جمیل؟ میں سلہٹ میں تھا تو اسے ایویکیویٹ کیا گیا تھا۔''

''یہ ایکپائرڈ،'' سرفراز نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اوہ، شٹ۔'' (۲۸)

ناول کے بیانیہ میں انگریزی کے الفاظ اور جملوں کا استعمال کس حد تک فائدہ مند اور کس حد تک بے مقصد ہوسکتا ہے اس بحث سے قطع نظرلیکن یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ بیانیہ میں انگریزی جملوں کا استعمال ہر ایک ناول نگار کے بس کی بات نہیں ان کے استعمال کے لئے کردار کا چناؤ اور ساتھ ہی ساتھ موقع کی دستیابی اور اس سے بھی بڑھ کر کہ واقعہ کی نوعیت کا اس سے مطابقت رکھنا ضروری ہے۔ان تمام اُمور پر عبداللہ حسین کو دسترس حاصل ہے اسی لئے سرفراز اور عمران کے مابین مکالمہ کی شکل میں ان کی باہم گفتگو کو اردو انگریزی کے الفاظ اور جملوں کو ملا کر پیش کیا گیا ہے جس سے واقعہ کو سمجھانے اور سمجھنے میں دوہرا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور مصنف ان دونوں کے ملاپ سے اپنے قاری کو مطمئین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان مہیا کرنے میں کامیاب بھی رہا ہے۔

مصنف سرفراز کے کردار کے ذریعے واقعات کو آگے بڑھاتے ہوئے مشرقی پاکستان میں پاکستان مخالف سرگرمیوں کے حوالے سے پاکستانی فوج کے کردار کو واضح کرتا ہے اور اس دوران انہیں جن مسائل ار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا بھی مصنف بیانیہ میں ذکر کرتا ہے۔ یہ وہ موقع ہے کہ جس وقت پاکستانی فوج پر مسلح دہشت گردوں نے گرنیٹوں کے ذریعے حملہ کردیا جس وقت پاکستانی فوج کے اہلکار اپنے میسوں میں موجود تھے جن میں بنگالی افسران بھی تھے جوفوج کا حصہ تھے انتہائی چابک دستی سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نکل گئے مگر سرفراز اوراس کا فوجی افسر دوست اور دوسرے فوجی جوان شدید زخمی ہوئے جس کے بعد انہیں ہسپتال لیجایا گیا جہاں ان کا علاج ہوتا ہوا۔اس وقت بھارتی افواج بنگلہ دیش علیحدگی پسندوں کا ساتھ دینے کے لئے میدان میں اُتر چکی تھی اور پاکستانی فوج کے خلاف برسر پیکارلیکن پاک آرمی بھی ان سے مقابلہ کر رہی تھی۔دوسری طرف ناول نگارمشرقی پاکستان میں اٹیک کے بعد پاکستانی فوجیوں کی ہسپتال میں علاج معالجہ کو بھی تاریخ کا حصہ بناتے ہوئے تاریخی واقعہ کے ایک ایک پرت کو بغیر کسی مشکل کے ساتھ دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ایک مقام پر نادارلوگ میں پاکستانی افواج کے افسران کے علاج سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹروں کے مختصر راؤنڈ اور ڈریسنگ کے بعد وہ سارا دن مکمل طور پہ فارغ ہوتے تھے۔'' (۲۹)

مصنف کا کہنا ہے کہ ڈریسنگ کے بعد وہ سارا سارا دن فارغ رہتے تھے یہاں ایک بات جو میں سمجھا کہ ہسپتال میں دوائیوں اور علاج معالجہ کی غرض سے ہی افراد آتے ہیں اور تقریباً فارغ ہی رہتے ہیں۔اس میں کوئی اچھنبے کی بات نہیں اگر دیکھا جائے تو محض بیانیہ کو طول دینے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ مریض اس قابل ہوتے تو ہسپتال میں نہ جاتے بلکہ کوئی نہ کوئی کام کرتے اور جب وہ کام کرتے تو پھر ہسپتال میں کیوں داخل کیا جاتا۔کام تو تندرست افراد ہی کرتے ہیں پھر ہسپتال تو مریض کے لئے آرام اور علاج کی جگہ ہے نہ کہ کام کی ،ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ فارغ رہنا بھی ایک مشکل کام ہے لیکن مریض کے لئے آرام کرنا ہی مناسب ہے۔

بیانیہ میں مصنف جنگی ہولناکیوں اور شدت کا ذکر ایک سلیم نامی نوجوان کے کردار کے ذریعے کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''جنگ کے دوران اس کا چہرہ اور سینہ بری طرح جھلس گیا تھا اور پٹیاں اس طرح بندھی تھیں کہ صرف ناک،منہ اور آنکھوں کے سوراخ کھلے تھے۔جب اس کی پٹی کی جاتی تھی تو جلد چیتھڑوں کی مانند اُترتی تھی اور دوسرے منہ پھیر لیتے تھے۔'' (۳۰)

ملک کی خاطر قربانیوں کا سلسلہ ابھی تھمہ نہیں تھا کیونکہ ملک دولخت ہونے کا وقت قریب تھا اب قربانی اور جذبے سے کام لینے کا وقت تھا۔ ملک و ملت سے کون پیار نہیں کرتا اور پھر جب ملک پر کوئی بری نگاہ ڈالتا ہے تو پھر غیرت جاگ ہی جاتی ہے۔سلیم جیسے کئی نوجوانوں نے ملک کی خاطر قربانیاں دیں اور اب بھی وہ لوگ کہ جنہوں نے ملک کو دوٹکڑے ہونے کے خلاف تحریک میں اور پاکستانی فوج کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر جدوجہد میں حصہ لیا تھا انہیں اس وقت کی حکومت تختہء دار پر چڑھا رہی ہے اور کئی محبّ وطن رہنما پھانسی چڑھائے جا چکے ہیں جو کہ انتہائی تکلیف دہ بات ہے جو بنگلہ دیش کی حکومت نے روا رکھی ہوئی ہے۔مشرقی پاکستان میں مقید پاکستان آرمی اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ رابطہ کے لئے خط لکھتے ہیں

مصنف نے کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان حالات کو ان فوجیوں کے خطوط کے ذریعے منظر عام پر لے آئے۔مصنف نے ان خطوط کو اپنے ناول کے بیانیہ میں کچھ اس طرح بیان کیا:

''ہسپتال سے فارغ ہو کر ہمیں ٹرین سے نارائن گنج ،پھر سٹیمر کے ذریعے دریائی راستے سے لے جایا گیا۔رات کے وقت سٹیمر ایسی جگہ پہ کھڑا کیا جاتا جہاں دریا مگرمچھوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا تاکہ ہم میں سے کوئی فرار نہ ہو سکے۔اس طرح ہم کلکتے پہنچے ۔وہاں سے پھر ٹرینوں پر سوار کرا کے اس شہر میں پہنچایا گیا جس کا نام رانچی ہے۔اب ہم شہر کے باہر کیمپ نمبر اٹھانوے میں مقید ہیں۔ان حرامیوں نے ہمیں نظر بند کرنے کے لئے کیچ تیار کر کے رکھے ہیں۔'' (۳۱)

دیکھا جائے تو پاکستانی فوج کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا جس کا ذکر مصنف نے تفصیلاً ناول کے اس بیانیہ میں کر دیا ہے۔ ان کے خطوط کے ذریعے ان پر ڈھائے جانے والے مظالم جو کہ انتہائی غیر انسانی اور غیر فطری اور اخلاقی نوعیت کے تھے۔پاک فوج کے سرینڈر ہونے کے واقعات کو بھی جو کہ ایک تاریخی بزدلی کی طرف اشارہ کرتی ہے بیان کرنے سے ہرگز نہیں گھبرائے۔اگرچہ یہ خط جس میں ان تمام واقعات کو ایک افسانوی رنگ دے کر پیش کیا گیا ہے مگر ان واقعات کو اتنے کھلے اور بنا پابندی ظاہر کرتے ہوئے بیان کرنا ان فوجیوں کے اندر کے حالات کو نہ بیان کرتے ہوئے بھی بالکل حقیقت کا روپ دے کر بیان کر دیا گیا ہے۔یہ وہ وقت تھا کہ جب دونوں بازوؤں میں سخت سیاسی کشمکش جاری تھی اور ملک کے حالات انتہائی گھمبیر شکل اختیار کر چکے تھے۔انہی وجوہات کی بنا پر بنگلہ دیش پاکستان سے الگ ہوا اور یہ علیحدگی لسانی بنیاد پر ہوئی جس میں اقتدار کے نشے نے بھی اہم کردار ادا کیا جس میں سب سے بڑا اور اہم کردار بھارت کا تھا جس کی وجہ سے پاکستان کو اپنا بازو کھونا پڑا اور دوسری بات مشرقی اور مغربی پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کی اقدار کی خاطر باہمی کشمکش کا نتیجہ بھی تھا۔اس طرح اب ان کا لیڈر جو کہ ان باغیانہ رویوں کی وجہ سے قید کیا گیا تھا۔رہائی کے بعد اپنے نئے آزاد ملک چلا گیا جبکہ مغربی حصے میں مارشل لاء ابھی قائم تھا۔مصنف مشرقی حصہ الگ ہونے کے بعد کے حالات کے بارے میں لکھتا ہے:

''جنگ میں شکست کے احساس نے قوم کے دل کو شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔نہ شکنجہ

ڈھیلا ہوتا تھا، نہ جذبات کو نکاس کا رستہ ملتا تھا۔ایک ''صم بکم'' کی کیفیت تھی جس نے اسے موضوع ممنوعہ کی حیثیت دے دی تھی۔گویا لوگ دلوں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے ہوں۔'' (۳۲)

اب ہم مشرقی حصے کو کھو چکے تھے اور بہت سے افراد کو بنگلہ دیش کے قید خانوں میں قید کیا گیاان کے خاندانوں میں ایک طرح کی بے چینی اور اپنے پیاروں کا انتظار کرنے کی ہمت جواب دینے لگی مگر کیا کرتے مجبوری تھی کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔دراصل ان دونوں حصوں کا رشتہ دو بھائیوں کا رشتہ تھا اور دونوں بھائی ایک دوسرے کے مخالف کھڑے دکھائی دیتے تھے۔اسی باہمی ناچاقی کی بنا پر سقوط ڈھاکہ کا سانحہ رونما ہوا۔ملک چھوڑ کر بھاگنے والے ہندوؤں اور سکھوں کا مال ان کا ہدف تھا۔اب بھائی بھائی کے مال کا بھوکا اور خون کا پیاسہ دکھائی دیتا تھا سب تعلق اور واسطے دلوں سے فرار پا چکے تھے۔تاریخ نے اپنے سے سبق نہ سیکھنے والوں پہ غضب کے قہقہے لگانے شروع کر دیئے اعبداللہ حسین کا بیانیہ اس کا سر جھکا دیتا ہے کہ جس نے تاریخ سے سبق نہ سیکھا اس پر زمانے کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی ہنستی اور ان کا مذاق اُڑاتی ہے۔جیسا کہ سقوط ڈھاکہ کی صورت میں پاکستان کے ساتھ ہوا جسے بھولنا مشکل بلکہ ناممکن بات ہے۔

نادار لوگ تقسیم سے قبل کی زندگی کا بھی احاطہ کرتا ہے،تقسیم کے دوران کے حالات و واقعات کو بھی مختلف بیانیوں کے ذریعے نمایاں کرتا ہے اور تقسیم کے بعد ملک کے سیاسی حالت اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا بھی احاطہ کرتا ہے۔عبداللہ حسین نے ایک ایسی نادار قوم کی کہانی بیان کی ہے جو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے بعد بھی مختلف قسم کی سازشوں کا بھی شکار رہے اور بدعنوان طبقات کے ہاتھوں ان کا استحصال جاری رہا۔

ناول میں تقسیم ہند سے قبل کے سماجی حالات کی تصویر کشی جن بیانیوں میں کی گئی ہے وہ پر اثر ہیں۔ مصنف نے مسلم سکھ معاشرے میں امن و آشتی اور باہمی اخوت کو مختلف واقعات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ مثلاً امرتسر کے نواح میں کبیر سنگھ والا نامی گاؤں میں اکثریتی آبادی سکھوں کی ہے۔مسلمانوں کا صرف ایک گھرانہ ہے لیکن ان میں کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے۔سکھ برادری مسلمان گھرانے کی ہر غمی خوشی میں شامل ہے اور جب سیاسی حالات کشیدہ ہو جاتے ہیں اور فسادات پھوٹ پڑتے ہیں تو کبیر سنگھ والا کے سکھ اس مسلمان

گھرانے کی حفاظت کرتے ہیں۔مسلمان گھرانے کو بچانے والے بھی سکھ ہیں جبکہ آنے والے بلوائی بھی سکھ ہیں لیکن مسلمان نسل درنسل یہاں رہتے آئے ہیں اس لیے سکھ ان کی حفاظت کو اپنا سماجی فریضہ سمجھتے ہیں۔

ناول میں تقسیم کے دوران ہجرت کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے اور ہجرت کے دوران فسادات اور مظالم کی داستانیں بھی رقم کی ہیں اور آزادی کے بعد ملکی انتظام میں بے قاعدگی اور بدعنوانیوں کو بھی اپنے بیانیوں کا حصہ بنایا ہے۔مصنف نے اس حوالے سے ہجرت کرکے آنے والوں کے مسائل کی بھی افسانوی انداز میں نشاندہی کی ہے۔اپنے مکانات،دکانیں اور زمینیں چھوڑ کر آنے والوں کو یہاں سر چھپانے کے لیے جگہ کا ملنا مشکل ہو رہا تھا جبکہ ناجائز طریقوں سے یہاں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں پر قبضے کے واقعات کو بھی مصنف نے کھل کر بیان کیا ہے۔

کسان یونینز اور بھٹہ خشت مزدوروں کی زبوں حالی کو بھی ناول میں نمایاں کیا گیا ہے۔بھتہ مالکان کے مظالم نے مزدوروں سے زندگی کا حق ہی چھین لیا ہے۔غریبوں اور مزدوروں کے حالات کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ناول کے بیانیے سیاسی حالات پر بھی مبنی ہیں۔ایک جلسے میں بنگال کے مولانا بھاشانی کی آمد اور استقبال کا منظر بیان کیا گیا ہے۔اس طرح غریبوں اور مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کا نعرہ لگا کر وجود میں آنے والی پیپلز پارٹی کے ارتقائی ادوار کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔سیاسی حالات و واقعات کو مختلف بیانیوں کا حصہ بنانے میں فوجی ڈکٹیٹروں کے کردار اور سیاست پر ان کے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی جدوجہد اور عوامی انداز کو بھی بیانیوں میں پیش کیا گیا ہے۔

سیاسی حوالوں سے سقوط ڈھاکہ ایک اہم حوالہ ہے۔مشرقی پاکستان میں بانی تحریک کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کے منفی سیاسی رویے کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔مصنف نے سیاسی لیڈروں کی اقتدار کے لیے رسہ کشی کو بھی موضوع بنایا ہے۔

۱۹۷۱ کی جنگ اور اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد عام پاکستانیوں کے جذبات و احساسات کو بھی ناول نگار نے خوب نمایاں کیا ہے اور اس کے لیے پھر اثر افسانوی بیانیے رقم کیے ہیں۔وہ لوگوں کی کیفیت کو پر اثر الفاظ میں نمایاں کرتے ہیں۔

نادار لوگ سماجی اور معاشرتی حوالے سے بھی ایک کامیاب ناول ہے اور سیاسی حوالوں کے باعث اس کی تاریخی اور سیاسی اہمیت بھی قائم ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ عبداللہ حسین، *نادار لوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص ۴۶

۲۔ ایضاً ص ۵۸

۳۔ ایضاً ص ۶۵

۴۔ ایضاً ص ۶۵

۵۔ ایضاً ص ۶۶

۶۔ ایضاً ص ۶۶

۷۔ ایضاً ص ۸۴

۸۔ ایضاً ص ۸۵

۹۔ ایضاً ص ۱۰۷

۱۰۔ ایضاً ص ۱۰۷

۱۱۔ ایضاً ص ۱۴۸

۱۲۔ ایضاً ص ۱۷۱

۱۳۔ ایضاً ص ۱۹۷

۱۴۔ ایضاً ص ۲۰۳

۱۵۔ ایضاً ص ۲۴۸

۱۶۔ ایضاً ص ۲۴۸

۱۷۔ ایضاً ص ۳۶۵

۱۸۔ ایضاً ص ۳۷۰

۱۹۔ ایضاً ص ۳۷۰

۲۰۔ ایضاً ص۳۷۷

۲۱۔ ایضاً ص۳۸۳

۲۲۔ ایضاً ص۳۸۷

۲۳۔ ایضاً ص۳۸۸

۲۴۔ ایضاً ص۳۸۸

۲۵۔ ایضاً ص۴۰۹

۲۶۔ ایضاً ص۴۲۴

۲۷۔ ایضاً ص۴۴۱

۲۸۔ ایضاً ص۴۴۴

۲۹۔ ایضاً ص۴۴۷

۳۰۔ ایضاً ص۴۴۸

۳۱۔ ایضاً ص۴۵۳

۳۲۔ ایضاً ص۴۵۳

باب چہارم
ناول ''راکھ'' اور ''نادار لوگ'' کے افسانوی بیانیوں کا تقابلی مطالعہ

مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ اور عبداللہ حسین کا نادار لوگ تاریخی زمانہ میں منظر عام پر آئے اور دونوں کا پس منظر اور زمانہ بھی تقریباً ایک ہی ہے دونوں ناول قیام پاکستان کے حالات و واقعات اور پاکستان کی سیاسی و سماجی تاریخ پر مبنی ہیں۔ نادار لوگ میں قیام پاکستان کے حالات ،واقعات کو بھی پیش کیا گیا ہے اوراس ناول میں ایک خاندان کی پاکستان کو ہجرت اور ان کے حالات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ناول میں ملک کے موجودہ سیاسی اور معاشرتی حالات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔عبداللہ حسین کے ناول میں پاکستانی معاشرہ اور ماحول نمایاں ہے۔ناول کے بیانیوں میں کہیں محبت کی کہانی ہے تو کہیں سیاست کی۔محبت ،سیاست اور تاریخ کے واقعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں جس میں ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو مختلف حوالوں اور مختلف بیانیوں کے ذریعے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ میں بھی ملک کی سیاسی زندگی کے کئی زاویے نمایاں کیے گئے ہیں۔ناول ہمارے ملک کی پچاس سالہ زندگی کے عروج و زوال کو ظاہر کرتا ہے۔سیاستدانوں کے قول وفعل کے تضادات کو مختلف بیانیوں میں نمایاں کیا گیا ہے ساتھ ہی ساتھ بیوروکریسی کی نجی زندگی سے بھی پردہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔تقسیم کے وقت لوٹ مار کے ذریعے اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے والوں کے مکروہ کردار بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ راکھ میں بھی تقسیم ہند کے فسادات اور ہجرت کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔تاریخی زمانے کے لحاظ سے دونوں ناولوں کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے اور موضوع بھی یکساں ہے۔دونوں ناول نگاروں نے قیام پاکستان کے حالات و واقعات کو بھی موضوع بنایا ہے اور ملک میں پائی جانے والی سیاسی بے ضابطگیوں اور بے راہ رویوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔

تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کو دونوں ناول نگاروں نے ناولوں کے بیانیوں میں جگہ جگہ موضوع بنایا ہے لیکن دونوں کے ہاں فسادات اور نقصانات کو غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔نقصان جانی تھا یا املاک کا دونوں ناول نگاروں کے ہاں اس کی تصویر کشی غیر متعصّبانہ انداز میں کی گئی ہے۔دونوں کے ہاں انسانی حوالے نمایاں ہیں،تعصب اور تنگ نظری کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ ہر مصنف کا کسی بھی سیاسی یا سماجی ایشو پر ایک ذاتی نقطہ نظر ہوتا ہے اور اس کی تحریر میں اس کا ذاتی نقطہ ءنظر کسی نہ کسی حوالے سے نمایاں ہوتا ہے خاص طور پر تقسیم ہند جیسے اہم واقعے پر ہر ادیب اپنا ایک خاص نقطہ نظر رکھتا ہے اور اپنے آپ سے محبت اور اپنے دین سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے لیکن تقسیم ہند کے دوران فسادات کو دونوں ناول

نگاروں نے مذہب اور وطن کی محبت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انسانی حوالے سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ایسے بیانیوں میں دونوں ناول نگاروں کی وسعت نظر پائی جاتی ہے۔

عبداللہ حسین نے تقسیم ہند سے پہلے کے حالات و واقعات کو ناول کے بیانیوں میں سموتے ہوئے مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے مشترک معاشرے کے حدوں کو کئی حوالوں سے اپنے بیانیوں میں بیان کیا ہے۔ان میں مشترک معاشرت بھی ہے ،باہمی انسانی ہمدردی اور خلوص کے مذہبی اور سیاسی نظریات اپنی جگہ مگر انسانی حوالوں سے ایک ہی معاشرے کا حصہ ہونے کے ناطے مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگوں کی ذہنی کیفیات اور باہمی اخوت کو جگہ جگہ نمایاں کیا گیا ہے۔مسلم سکھ معاشرے کا خاکہ کھینچتے ہوئے عبداللہ حسین امرتسر کے ایک نواحی گاؤں کبیر سنگھ والا میں سکھوں کی اکثریتی آبادی اور مسلمانوں کا صرف ایک گھرانے کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے:

> امرتسر کے نواح میں سکھوں کے اس چھوٹے سے گاؤں کبیر سنگھ والا میں اعوانوں کا ایک ہی مسلمان گھرانہ تھا۔کچھ اس بنا پر اور باقی کچھ اس وجہ سے کہ اپنی قوم کو نام کا اٹوٹ انگ بنانا اعوانوں کی ریت تھی۔دونوں باپ بیٹا ایوب اعوان اور یعقوب اعوان اپنے پورے پورے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔اپنے باپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے یعقوب اعوان کے آہستہ آہستہ سرد ہوتے ہوئے خون میں کہیں کہیں سے لہر پیدا ہوتی۔اب اس کو اس رات کی تصویر نظر آ رہی تھی جس کی صبح کو وہ پہلی بار اپنا گاؤں چھوڑ کر گیا تھا۔(۱)

عبداللہ حسین نے سکھوں کے چھوٹے سے اس گاؤں میں ایک مسلمان گھرانے کا ذکر کیا ہے۔سکھوں کے پورے ایک گاؤں میں ایک مسلمان گھرانے کا وجود ثابت کرتا ہے کہ اس زمانے میں مسلم سکھ مشترک معاشرت نہ صرف ممکن تھی بلکہ سماجی زندگی کے حوالے سے ان میں قربت اور انسانی ہمدردی اور اخوت بھی موجود تھی۔اگر ایسا نہ ہوتا تو سکھوں کے گاؤں میں صرف ایک مسلمان گھرانے کا رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔مزید یہ کہ عبداللہ حسین نے اس مسلم گھرانے کی بیانیہ میں خصوصیت بھی بیان کی ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس گاؤں میں یہ مسلمان گھرانہ خود کو مسلمان اور اعوان قبیلے کا ظاہر کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتا تھا۔عبداللہ

حسین نے اس خصوصیت کو نمایاں کرنے کے لیے لکھا ہے کہ کبیر سنگھ والا میں اعوانوں کا ایک ہی مسلمان گھرانہ تھا۔ کچھ اس بنا پر اور باقی کچھ اس وجہ سے کہ اپنی قوم کو نام کا اٹوٹ انگ بنانا اعوانوں کی ریت تھی۔ اس بیانیے سے واضح ہوتا ہے کہ ایک تو یہ لوگ مسلمان تھے جیسا کہ کاموں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی قومیت کو بھی اپنے نام کا حصہ تصور کرتے اور ایوب اور یعقوب کی بجائے ایوب اعوان اور یعقوب اعوان مشہور تھے۔

اس گاؤں میں سکھوں اور اس مسلمان گھرانے کی سماجی زندگی میں کوئی دوری نہ تھی۔ ایک دوسرے کے دکھ درد اور غمی خوشی، شادی بیاہ میں ایسے ہی شریک ہوتے جیسے اپنے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اس گاؤں میں جگت سنگھ کی شادی کی بارات کا خاکہ ناول نگار نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

> ۔۔۔اس کے باوجود لڑکیاں والیاں جگت سنگھ اور یعقوب اعوان کو دیکھ دیکھ کر جو دونوں ایک ہی خچر پر سوار ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے، ٹھکیلیاں کرنے سے باز نہ آتی تھیں (۲)

جگت سنگھ سکھ ہے اور یعقوب اعوان مسلمان ہے دونوں میں مذہب کے اختلاف کے باوجود معاشرتی زندگی میں ان کی قربت اتنی گہری ہے کہ شادی کی بارات میں دونوں ایک ہی خچر پر سوار ہیں۔ دیگر بیانیوں میں بھی سکھوں اور مسلمانوں کی معاشرتی قرابت داری نمایاں کی گئی ہے لیکن بارات کے منظر کے بیانیے میں اس کو خوب نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ بیانیہ فطری انداز میں ہے۔ بیانیہ پڑھتے ہوئے قاری ایک معاشرتی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے وہ خود کو اس معاشرتی زندگی اور خصوصاً بارات کے ساتھ شامل پاتا ہے۔ بیانیہ میں غیر ضروری طوالت یا کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے۔ نہ بیان کی پیچیدگی اور نہ ہی کرداروں کے اتھل پتھل کی پیچیدگی ہے لیکن اس کے مقابلے میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''راکھ'' میں ایسے بیانیے کافی پیچیدہ ہیں۔ کہیں الفاظ کی پیچیدگیاں ہیں اور کہیں بیان کی طوالت پائی جاتی ہے۔ گوالمنڈی اور لکشمی مینشن کی زندگی کو نمایاں کرتے ہوئے ان کا ایک مختصر بیانیہ یہ ہے کہ:

> گوالمنڈی اور لکشمی مینشن دو الگ الگ دنیائیں تھیں اور وہ ابھی اس دنیا کے رسم و رواج سے اگاہ نہیں تھا۔ (۳)

لکشمی مینشن کا محل وقوع اور ماحول بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے غیر ضروری طور پر طویل اور پیچیدہ بیانیوں سے کام لیا ہے۔ایسی طوالت اور پیچیدگی کہ کہیں کہیں ایک جملہ ایک پورے پیرا گراف کے برابر لگتا ہے۔مثال کے طور پر لکشمی مینشن سے متعلق یہ بیانیہ ملاحظہ ہو جو بغیر فل سٹاپ کے ایک پیراگراف کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

> لکشمی مینشن کی سہ منزلہ فلیٹوں کی لمبی مستطیل چھت پر شاہد کی کھلی آنکھوں پر جو آسمان تھا اس کی نیم تاریکی میں صرف ریگل چوک کے پار''سٹینڈرڈز'' کے اوپن ایئر ریستوران میں سجاوٹ کے قمقموں کی ہلکی روشنی تھی جو اس تاریکی میں آگے ہو کر بجھتی جاتی تھی اور اس کے کانوں میں موسیقی اور تماشائیوں کا ہلکا شور تھا اور اس شور کے درمیان سڑک کے پار''سٹینڈرڈز'' کی چھت پر شہر لاہور کی اکلوتی اور من پسند ڈانسر اینجلا ناچے جا رہی تھی(۴)

اس ایک بیانیے میں لکشمی مینشن کے خدوخال، رات کا سماں، ریگل چوک ،سٹینڈرڈز نام کے ریستوران کا ماحول، لوگوں کا شور اور اینجلا کا ڈانس وغیرہ بہت سے مناظر کو یوں یکجا کر کے ایک بیانیے میں سمویا گیا ہے کہ بیانیہ رواں دواں نہیں رہتا بلکہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔اس بیانیے میں غیر ضروری طوالت ہے جس منظر اور ماحول کو ناول نگار اس بیانیے کے ذریعے سامنے لانا چاہتا تھا اکثر وہ اپنی ان تمام تر جزئیات کے ساتھ ان کے خیال میں ضروری تھا تو اس کے بیان کے لیے جملوں کو علیحدہ علیحدہ بھی لکھا جا سکتا تھا اور اگر ایک ہی جملے میں بیانیے کو پیش کرنا ضروری تھا تو اس کی غیر ضروری طوالت کو کم کرنے پر توجہ دینی چاہیئے تھی۔اس طرح کے طویل اور پیچیدہ قسم کے بیانیے ان کے ناول میں جا بجا پائے جاتے ہیں ایک اور بیانیہ ملاحظہ ہو:

> ڈیفنس کے اُس مینشن نما گھر کے چوراہے میں جسے باہر کی دیوار کے ساتھ سرسبز کٹاؤ والے پتوں کے ناریل کے درختوں کی وجہ سے ناریل والا گھر کہا جاتا تھا قدیم ماڈلز کی لیکن تقریباً شوروم کنڈیشن کی دو کاریں آگے پیچھے اینٹوں کے چبوترے پر ایک عرصے سے Rest in Peace کر رہی تھیں۔(۵)

عبداللہ حسین کے ناول نادار لوگ کے بیانیوں میں بھی طوالت پائی جاتی ہے لیکن کسی منظر اور ماحول کو بیانیے کا حصہ بنانا مقصود تھا اس کو فطری انداز میں بیان کیا ہے۔جتنی تفصیلات دی گئی ہیں وہ ماحول اور منظر کو نمایاں کرنے کی خاطر ہیں تا کہ اس بیانیے کے ذریعے قاری پر پورا ماحول اپنی ضروری جزئیات کے ساتھ واضح ہو۔گاؤں کبیر سنگھ والا میں سکھوں کی آبادی میں صرف ایک مسلمان گھرانے کا ذکر کرنے کے بعد جگت سنگھ کی شادی اور بارات کا ذکر کرتے ہیں تو اس بیانیے میں سکھوں اور مسلمانوں کی معاشرتی قربت کو ظاہر کرتے ہوئے یعقوب اعوان اور جگت سنگھ کو ایک ہی خچر پر سوار دکھاتے ہیں۔بارات کے منظر کا یہ بیانیہ حقیقی صورت حال جیسا فطری محسوس ہوتا ہے اور اس فطری پن میں کہانی کے ساتھ ساتھ بیانیے کی زبان سلیس اور رواں دواں ہے۔اس طرح جب فسادات شروع ہوتے ہیں تو کبیر سنگھ والا میں سکھوں نے یعقوب اعوان کو فسادیوں سے بچائے رکھنے کی کوشش کی۔جگت سنگھ نے یعقوب اعوان کو اپنے گھر بلا لیا تھا تا کہ فسادی ان کے گھر پر حملہ کر کے ان کو نقصان نہ پہنچا ئیں۔اس وقت کے حالات کو عبداللہ حسین نے نہایت پر اثر اور حقیقی انداز میں بیانیے کا روپ یوں دیا ہے:

> یعقوب اعوان، زینب اور المعاذ کو لے کر گھر سے نکلا تھا کہ بلوائیوں کی ہا ہا کار سنائی دینے لگی۔ابھی اعوانوں کا قافلہ بھگت سنگھ کے ڈیرے پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے دھوئیں میں لپٹے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔طویلے سے بھینس اور بچھڑی کے ڈکرانے کی اذیت ناک آوازیں نکلیں اور اٹھتے اٹھتے ایسے شور کی صورت میں بدل گئیں جو پندرہ سالہ اعجاز نے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔مویشیوں کی چیخیں سارے گاؤں پہ چھا گئیں۔یعقوب اعوان بھاگ کر اپنے گھر کو پہنچنے کے لیے زور مار رہا تھا،مگر جگت سنگھ اور اس کے چچا کی گرفت اسے ہلنے نہ دیتی تھی۔آخر وہ ہار کر وہیں کھڑا ویران نظروں سے جلتے ہوئے گھر کو دیکھنے لگا۔(۶)

عبداللہ حسین نے درج بالا بیانیے میں کبیر سنگھ والا گاؤں میں ایک ہی مسلمان گھرانے پر حملہ کرنے اور گھر کو آگ لگانے کا منظر کچھ اس انداز میں بیان کیا ہے کہ نہ بلوائیوں اور نہ گھر کی آتشزدگی پر براہ راست لکھا ہے بلکہ جگت سنگھ کے گھر میں پناہ لئے یعقوب اعوان کی حالت کو براہ راست بیانیے کا حصہ بنایا ہے اور اس کے گھر پر حملے کو جانوروں کی خوفناک آوازوں اور آگ کے شعلوں سے نمایاں کیا ہے۔یہ اس بنانیے کی

ایک فنی خوبی ہے۔

اس طرح کے بیانیے مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ میں بھی ہیں لیکن ان میں منظر اور ماحول کے ضروری خدوخال نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ جزئیات کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اگرچہ کسی بیانیے میں جزئیات کا نمایاں کرنا ضروری ٹھہرتا ہے کیونکہ وہی جزئیات ایک منظر اور ماحول کو قاری کی آنکھوں کے سامنے پھیلاتے ہیں اور ایک تاثر قائم کرتے ہیں لیکن کہیں پر بیانیے کے جزئیات محض جزئیات نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ناول راکھ کے ذیل کے بیانیے میں بھی غیر ضروری جزئیات نگاری کا عنصر غالب محسوس ہوتا ہے:

> پاکستان بن چکا تھا۔شاہ عالمی کی عظیم آگ جس نے لاہور کے آسمان کو کئی روز تک سرخ کیے رکھا تھا اور جلے ہوئے بہی کھاتوں، کتابوں اور کپڑوں کے پرکٹے سیاہ پرندے اُڑائے تھے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ رنگ محل چوک سے لے کر تقریباً پون میل کے فاصلے پر واقع شاہ عالمی چوک تک جو قدیم رہائش گاہیں، حویلیاں، عبادت گاہیں اور دکانیں تھیں اب وہاں نہیں تھیں۔ان کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اونچے نیچے ٹیلوں اور ملبے کے ڈھیروں کا ایک سلسلہ تھا جن میں چھوٹی اینٹ کی کوئی ایک دیوار کہیں نظر آجاتی۔کوئی منقش دروازہ جلی ہوئی حالت میں کسی جلی ہوئی ڈھیر میں جیسے باہر آنا چاہتا ہو۔مشن سکول کے بیشتر بچوں کا محبوب مشغلہ ان ڈھیروں پر چڑھنا اور دھول میں اٹ جانا اور پھر اپنی ماؤں سے مار کھانا تھا۔۔۔(۷)

یہ بیانیہ جو لاہور کی آتشزدگی کے بعد کے مناظر کو نمایاں کرتا ہے اور جس کا ایک چھوٹا سا اقتباس اوپر درج کیا گیا کافی طویل ہے۔ اس میں اچانک بچوں کا ذکر اور ماؤں سے مار کھانا اصل منظر میں اضافی محسوس ہوتا ہے۔

بیانیے کی طوالت یا اختصار دراصل ناول نگار کے اسلوب کا نتیجہ بھی ہوتا ہے اور کہانی کے اس حصے کا بھی تقاضا ہوتا ہے لیکن کہیں قاری محسوس کرتا ہے کہ بیانیے میں غیر ضروری اور پیچیدہ قسم کے مباحث میں اس

کو پھنسا دیا گیا ہے۔اگرچہ ناول ہے ہی ایک کہانی کی جزئیات نگاری کا نام لیکن غیر ضروری طوالت بہرحال قاری کو کھٹکتی ہے جیسے نـادار لوگ میں سرفراز اور اعجاز کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے اس مقام پر پہنچتے ہیں:

> دونوں پھر آگے پیچھے چلتے ہوئے کسی سڑک پر پہنچ گئے۔چلتے چلتے سرفراز پیچھے رہ جاتا۔کبھی رک کر خودرو پھولوں کو توڑنے لگتا، پھر دوڑتا ہوا اعجاز سے جا ملتا۔۔۔(۸)

اس بیانیے میں جب اعجاز ڈھڈی والے کے نواح میں پہنچتا ہے اور رائے بشن داس کی حویلی اور ملحقہ زمین کے برابر سے گزرتا ہے تو سڑک کو پکی کرنے کی منظوری اور ساتھ ہی ساتھ شیر بہادر کی طرف سے اس زمین پر قبضہ کرنا کیا بیانیہ جس میں یعقوب اعوان کو اردو جملے رٹا کر بیان دینے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔کافی طویل اور پیچیدہ ہے چار صفحات پر پھیلا ہوا یہ بیانیہ قاری کو کھٹکتا ہے۔

نـادار لوگ میں تقسیم ہند کے دوران فسادات کی تصویر کشی امرتسر کے نواح میں سکھوں کے ایک گاؤں کبیر سنگھ والا نامی گاؤں کی کی گئی ہے۔ یہ سکھوں کا گاؤں ہے جہاں یعقوب اعوان کا گھرانہ اور مسلمان گھرانہ ہے یہ مسلمان گھرانہ سکھوں کی اس آبادی میں رہتا تھا کبھی غیر ہونے کا احساس نہ ہوا تھا سکھ اور مسلمان ایک ہی معاشرت کا پرامن حصہ تھے۔ان کی باہمی سماجی محبت کو فسادات کے دوران یوں نمایاں کیا گیا ہے کہ جب باہر سے کچھ فسادی اس گاؤں میں آکر یعقوب اعوان اور ان کے گھر کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے تو گاؤں والے یعقوب اعوان اور اس کے گھر کی حفاظت کررہے تھے۔باہر سے آئے بلوائیوں کو روکنا یا ان کا مقابلہ کرنا گاؤں والوں کے لیے مشکل بھی تھا اور اس لحاظ سے خطرناک بھی تھا کہ وہ ایک مسلمان گھرانے کو بچانے کے لیے اپنے سکھوں کے مقابلے نکلتے ہیں تو اس صورتحال میں گاؤں والے صرف یعقوب اعوان کی حفاظت کرتے ہوئے اسے اپنے ڈیرے میں چھپا لیتے ہیں جب کہ بلوائی اس کے گھر کو آگ لگا دیتے ہیں۔بلوائیوں کی آمد اور یعقوب اعوان کی تلاشی کا بیانیہ عبداللہ حسین نے اس گاؤں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کے تمام تر رنگوں کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔

> بلوائی دروازے تک آپہنچے۔ایک دو کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعلیں

تھیں۔''جگت سینہان'' ایک آواز آئی تیرے ساتھ کوئی لڑائی نہیں۔تُو اپنا بھائی ہے۔مسلموں کو اپنے حوالے کردے۔(۹)

ایسے خطرناک حالات میں بھی جگت سنگھ نے یعقوب اعوان کو تحفظ فراہم کیا۔اسے اپنے گھر میں بٹھائے رکھا اور نہ دروازہ کھولا اور نہ یعقوب کو بلوائیوں کے حوالے کیا۔رات کو سکھوں کے اس گھرانے نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر مسلمانوں کے گھرانے کو راتوں رات یہاں سے نکالنے کی سکیم بنائی۔یہ مسلمان گھرانہ رات کے وقت کس طرح ہجرت پر نکلتا ہے،ناول نگار نے اس سفر کی ابتداء اس بیانیے میں کی ہے:

زینب اور اس کا سامان تیار کیا گیا جو ایک گٹھڑی پر مشتمل تھا جس میں کچھ کپڑے اور دو ایک گہنے تھے۔اعجاز اگرچہ میٹرک کا امتحان دے چکا تھا مگر اپنے گھر سے چلتے وقت اس نے گٹھڑی میں دو تین کتابیں ٹھونس لی تھیں۔اس کے علاوہ اس کے پاس صرف ایک سائیکل تھی جسے ساتھ لے جانے پر مصر تھا۔یہ مختصر سا قافلہ کوٹھوں کوٹھوں پر چلتا،دیواریں ٹاپتا،لکڑی کے تختوں کی مدد سے گلیاں عبور کرتا ہوا گاؤں کے اندر تک جا پہنچا۔وہاں ایک گلی میں دو گھوڑے تیار کھڑے تھے۔(۱۰)

فسادات کی تصویر کشی راکھ میں بھی خوب کی گئی ہے۔لاہور میں ہندوؤں اور سکھوں پر بھی حملے کئے گئے۔ایسے حالات میں ایک گورکھا پلٹن لاہور آئی تو ناول نگار کے بقول ہندو اُسے لاہور میں پا کر اس کو اپنے لیے محمد بن قاسم سمجھتی رہی جب کہ مسلمانوں کے لیے وہ راجہ داہر تھی۔ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ہندوؤں اور سکھوں کے مکانات کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ہندو دکانداروں نے اپنی دکانوں کے لکڑی کے دروازوں پر ٹین کی چادریں چڑھا کر انہیں آتش زنی سے محفوظ کر لیا تھا مگر مسلمان تھانیدار نے ان دروازوں کو توڑنے کا حکم نوجوانوں کو دے دیا تھا۔ان حالات و واقعات کو مزید نمایاں کرنے کے لیے راکھ کا ذیل کا بیانیہ بھی اہم ہے۔ملاحظہ ہو:

ہندو شاہ عالمی دروازے کو مکمل طور پر بند کر کے محصور ہو چکے تھے اور اس علاقے کے اندر چڑیا بھی نہیں جا سکتی تھی لیکن ایک جانباز مجسٹریٹ محمد غنی چیمہ نے جان

پر کھیل کر چند مزید جانبازوں کو شاہ عالمی کے زیر زمین گندے نالے کے ذریعے
اندر پہنچایا اور انہوں نے اطمینان سے سکونت پزیر کافروں کے مکانوں اور
دکانوں کو آگ لگا دی۔ (۱۱)

تقسیم ہند کے وقت فسادات کی منظر کشی دونوں ناول نگاروں نے اپنے انداز میں کی ہے۔نادار لوگ میں فسادات، تباہی اور بربادی کے مناظر راکھ کے مقابلے میں کم ہیں مگر اثر انگیزی کے لحاظ سے اہم ہیں۔عبداللہ حسین نے مختلف بیانیوں میں ہجرت اور فسادات کی عکس بندی کی ہے۔تو مستنصر حسین تارڑ نے راکھ میں لاہور میں فسادات اور انسانی تباہی کے مناظر پیش کرتے ہوئے ٹرینوں میں گلی سڑی لاشوں کو بھی بیانیوں میں پیش کیا ہے۔نادار لوگ میں گاؤں کبیر سنگھ والا سے ایک مسلمان گھرانے کی ہجرت اور اسی دوران یعقوب اعوان کی بیوی کے ہاں زچگی ہوئی اور مناسب علاج نہ ہونے کے باعث وہ اپنی جان کی بازی ہار گئی۔اس المیے کو عبداللہ حسین نے اس بیانیے کا روپ دیا ہے:

دن چڑھنے میں بھی ایک گھنٹہ باقی تھا کہ اعوانوں کا کنبہ اپنے گاؤں کی حدود
سے نکل گیا۔سورج ایک ہاتھ اوپر آچکا تھا جب وہ زینب کے باپ کے گھر
پہنچے۔دن بھر زینب اپنے حمل کو سنبھالتی پھری جو قابو سے باہر ہوا جاتا تھا اس
کنبہ کی بوٹی بوٹی پر موت کی کیفیت طاری تھی۔ڈھڈی والے کی دائی اس کے
پاس بیٹھی رہی۔شام کے وقت اس کی حالت غیر ہوئی۔چار کوس دور نور پور کا
قصبہ تھا وہاں کی ڈسپنسری میں ایک ڈاکٹر موجود تھا۔جب تک زینب کا بھائی اپنے
ریہڑے پر ڈاکٹر کو لے کر آیا۔زینب ایک بیٹے کو جنم دے چکی تھی بچہ تندرست
حالت میں تھا مگر زچگی کی حالت نہ سنبھلی۔گھر بھر کی نئی پرانی چادریں بھیگ
گئیں اور اس کا خون پھر بھی نہ تھما۔ڈاکٹر نے خون بند کرنے کی سعی کی، ٹیکہ
لگایا۔دوائیاں دیں مگر زینب کی طاقت زائل ہو چکی تھی۔اپنے خاوند کا گھر
چھوڑنے کے بتیس گھنٹے بعد بے ہوشی کی حالت میں زینب کے بدن سے اس کی
زندگی کی آخری سانس خارج ہوگئی۔(۱۲)

''نادار لوگ'' میں انسانی مصائب و مشکلات کو نمایاں ضرور کیا گیا ہے لیکن فسادات میں انسانی تباہی اور مکانوں اور دکانوں کی ایسی تباہی نہیں دکھائی گئی جو ''راکھ'' میں دوطرفہ تباہی کے مناظر دکھائے گئے ہیں یعنی ہندو اور مسلمان دونوں کی انسانی تباہی اور شہروں میں مارکیٹوں ،گھروں کی تباہی کے مناظر دکھائے گئے ہیں جبکہ فسادات میں مرجانے والوں کی افسوس ناک اور ظالمانہ اموات کے مناظر ریلوے سٹیشن پر بہت ہی پر اثر انداز میں دکھائے گئے ہیں۔ ذیل کے اس بیانیے میں ریل کے اندر اور باہر ریلوے اسٹیشن پر مرے پڑے انسانوں کا جونقشہ کھینچا گیا ہے وہ بہت ہی کربناک اور اذیت ناک ہے:

> کامونکی اسٹیشن پر دوروز پیشتر ایک ٹرین روکی گئی تھی۔اس ٹرین میں اپنے گھر چھوڑ کر جانے والے تھے اور گھروں میں بوڑھے بچے جوان ،عورتیں اور مرد سبھی ہوتے ہیں۔اس ٹرین میں بھی تھے۔لیکن وہ اب نہیں تھے۔اب پچھلے دوروز سے وہ ٹرین ویران پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور اس میں بوڑھے بچے جوان عورتیں اور مرد سبھی گلتے سڑتے بدبودے رہے تھے اور تیز دھوپ میں کچھ جو پلیٹ فارم پر پڑے تھے وہ عجب مزاحیہ زاویوں میں آکڑے ہوئے تھے۔خون خشک ہو چکا تھا۔ (۱۳)

نادار لوگ اور راکھ دونوں ناولوں میں تقسیم ہند کے دوران ہونے والے فسادات کو غیر جانبدارانہ طور پرایک سچے ادیب کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ان فسادات کے دوران گھروں اور املاک کے ساتھ ساتھ انسانی جانوں کی تباہی کو انسانی بنیادوں پر دیکھا اور بیان کیا گیا ہے۔اس حوالے راکھ بیانیہ مذہبی تفریق سے قطع نظر حقائق کی بنیاد پر کھڑا ہے جس میں ناول نگار نے فسادات کے دوران آگ بھڑک اٹھنے کی صورت میں ایک مسجد کے محفوظ رہنے کے ساتھ ساتھ ایک مندر کے بھی بچ جانے کی بات کی ہے:

> شاہ عالمی کو جن جیالوں نے جلایا تھا وہ اس معجزے پر سر دھنتے تھے کہ بازار کے عین درمیان میں لال مسجد کو آگ نے چھوا تک نہیں تھا اور یہ حقیقت تھی کہ لوگ اس مسجد کی دیواروں کو چھو کر پیچھے ہو گئی تھی ویسے شاہ عالمی چوک میں ایک نہایت دیدہ زیب سنہری کلس والا مندر بھی آگ سے بچ گیا تھا لیکن یہ تو کوئی

قابل ذکر بات نہ تھی۔(۱۴)

نادار لوگ میں بھی حقیقت پسندی ہے۔سکھوں کے گاؤں ''کبیر سنگھ والا'' میں جگت سنگھ میں جس طرح ایک مسلمان گھرانے کی حفاظت کرتا ہے اور جس طرح ان کو بلوائیوں سے بچانے کی خاطر اپنے گھر لے جاتا ہے، یہ بیانیہ انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر اخوت اور بھائی چارے کی اعلیٰ مثال ہے۔جب بلوائی کبیر سنگھ والا کے قریب آ پہنچتے ہیں تو بھگت سنگھ یعقوب اعوان کیگھر آ کر اس سے کہتا ہے ''فسادی ہمارے گڑھ تک آ پہنچے ہیں۔اُٹھ کے ہمارے ڈیرے پر آجا''یعقوب اعوان کی بیوی بھی بیمار تھی۔اُسے سینتیس برس کی عمر میں حمل ٹھرا تھا۔جب دوسرے روز جگت سنگھ اور جسونت سنگھ آ کر یعقوب اعوان کے گھر بیٹھ گئے اور اُسے سمجھایا کہ ضد نہ کر تیری بیوی بھی بیمار ہے اس گاؤں میں تیرا ہی ایک گھر مسلمان ہے اور سب کی نظروں میں ہے، ہمارے ساتھ ہمارے گھر چل تا کہ بلوائیوں سے محفوظ رہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اپنے گاؤں کے حرام خور فسادیوں سے مل گئے ہیں۔چل اُٹھ۔خون خرابہ نہ کر اور یعقوب اعوان کے ساتھ ان کے ڈیرے پر منتقل ہو جاتا ہے اور اس دوران فسادی اس کے گھر کو آگ لگا دیتے ہیں۔

جب ہم دونوں ناولوں نادار لوگ اور راکھ کے مختلف بیانیوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو دونوں ناول نگاروں کے اسلوب میں کافی فرق نظر آتا ہے۔اسلوب ہر ناول نگار کا انداز تحریر ہی نہیں ہوتا انداز فکر بھی ہوتا ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں مصنف کی شخصیت ،اس کا مطالعہ اور نظریات سب کچھ اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔مصنف کا ذاتی مزاج بھی اسلوب میں جھلکتا ہے چونکہ راکھ کے مصنف مستنصر حسین تارڑ شگفتہ مزاج ہیں چنانچہ ان کے ناولوں کے بیانیوں میں زبان و بیان کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔شوخ اور شگفتہ جملے ان کے بیانیوں کو کہیں تو شوخ و شگفتہ بناتے ہیں اور کہیں مزاح کے قریب تر کردیتے ہیں۔لیکن ان کے بظاہر مزح،شگفتہ اور مزاحیہ قسم کے جملے یا الفاظ بھی ایک گہری معنویت رکھتے ہیں۔ان کی تحریر کی شوخی محض قاری کو شگفتہ تحریر دینا نہیں ہوتی بلکہ ایک گہرا مفہوم بھی ادا کرتی ہیں۔کہیں پر وہ قدرے شگفتہ الفاظ کے ذریعے ایک منظر کو خوب نمایاں کرتے ہیں۔ذیل کے ایک مختصر بیانیے میں بظاہر مزاحیہ الفاظ ہیں لیکن ان کے توسط سے منظر نگاری کا کمال ملاحظہ ہو:

انہوں نے آپا جی سے کچھ نہ کہا باورچی خانے سے چمٹا لائے اور کروشیے کے
غلاف کو اس کے ساتھ پکڑ کر اسے چولہے میں ڈال دیا جس پر آلو گوشت کی
ہنڈیا بڑبڑا رہی تھی۔(۱۵)

آلو گوشت کی ہنڈیا ابلتی ہے۔اگر مصنف لفظ ابلنا استعمال کرتے تو آنکھوں کے سامنے یہ منظر وضاحت اور خوبصورتی کے ساتھ نمایاں نہ ہوتا۔آلو گوشت کی ہنڈیا ابلتے وقت پانی کا اوپر کو اچھلنا اور ساتھ ہی ساتھ ابلنے کی ایک خاص آواز کو مصنف نے ''بڑبڑانا'' لکھ کر تھوڑے لفظوں میں ایک منظر اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا ہے۔شوخئ تحریر کی یہ مثالیں ''راکھ'' میں جا بجا موجود ہیں بلکہ سارے ناول کی زبان شگفتہ ہے البتہ کربناک واقعات کو ایک ایسی کرب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جسے پڑھ کر قاری پر بھی کرب کی ویسی ہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے مصنف کو گزرنا پڑا تھا لیکن مجموعی طور پر ناول کی تحریر میں شگفتہ پن نمایاں ہے۔ہر بیانیے کو الفاظ کی پرانی ترتیب کے بجائے نئی ترتیب اور نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اُرسلا اور مثیل کے درمیان ایک مکالمے میں ایک جگہ اُرسلا کس خوبصورتی سے مثیل کی عمر کے بارے میں بتاتا ہے اور اس سے پھر بھی اپنی محبت کا اعادہ کرتے ہوئے اس مثال سے ایک سیاسی بیانیے کی حقیقت نمایاں کرتا ہے:

یہ سب سیاست دانوں کی باتیں ہیں مثیل ہمارا ان سے کیا تعلق تمہیں پتا ہے نا
میں تم سے محبت کرتی ہوں اگرچہ تم اکیس برس کے نہیں ہو۔(۱۶)

نادار لوگ کے ناول نگار عبداللہ حسین ناول راکھ کے ناول نگار مستنصر حسین تارڑ کے مقابلے میں اپنے بیانیوں میں شوخی اور شگفتگی سے کام نہیں لیتے۔جہاں کسی کردار کے مکالموں میں اس قسم کی شوخی کی ضرورت تھی وہاں تو شگفتہ الفاظ اور جملے ضرور ملتے ہیں لیکن مجموعی طور پر ناول کے بیانیے سنجیدہ لہجے میں پیش کیے گئے ہیں۔دراصل اسلوب کا یہ فرق دونوں ناول نگاروں کی شخصیت اور مزاج کا بنیادی فرق ہے۔ہر ادیب کی تحریر اس کے ذوق اور مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔شگفتہ مزاج ادیب سنجیدہ بیانیے میں بھی شوخی کی ایک صورت پیدا کر دیتا ہے۔یہ شوخی اگر پورے جملے کی صورت میں نہ ہو لیکن الفاظ اور ان کی ترتیب یا مثال اور تشبیہ کی صورت میں ضرور ہوتی ہے۔ایک مثال ملاحظہ ہو کہ کامونکی ریلوے اسٹیشن پر تیز دھوپ میں مرے

پڑے لوگوں کی اکڑی ہوئی لاشوں کا خوف ناک اور کرب ناک منظر بیان کرتے ہوئے مصنف نے الفاظ کو کیسے استعمال کیا ہے اور کیسا مفہوم نمایاں کر کے کیسا منظر آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا ہے:

> بوڑھے بچے جوان عورتیں اور مرد سبھی گلتے سڑتے بدبو دے رہے تھے اور تیز دھوپ میں کچھ جو پلیٹ فارم پر پڑے تھے وہ عجب مزاحیہ زاویوں میں اکڑے ہوئے تھے (۱۷)

تیز دھوپ میں جو لاشیں پڑی تھیں۔دھوپ پڑنے اور خون خشک ہو جانے کے باعث وہ اکڑ گئی تھیں اور جب لاش اکڑ جاتی ہے تو گردن ، لے تو، بازو، ٹانگیں او پاؤں ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔مصنف نے یہ لکھ کر کہ ''وہ عجب مزاحیہ زاویوں میں اکڑے ہوئے تھے'' ایک خوف ناک منظر کو بھی شوخ لفظوں سے نمایاں کیا ہے۔نادار لوگ کے بیانیوں میں اس قسم کی شوخی تحریر کے نمونے کم ملتے ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔نادار لوگ کی تحریر میں سنجیدگی اور سادگی کا عنصر غالب ہے۔

''نادار لوگ'' اور ''راکھ'' میں سیاسی بیانیوں کا تقابلی مطالعہ:

عبداللہ حسین کا ناول نادار لوگ خصوصاً ۱۹۴۷ء تک کے عرصے کا پس منظر ہے۔ناول میں معاشرتی زندگی اور معاشرے کے مسائل و مصائب کو نمایاں کیا گیا ہے۔معاشرتی زندگی میں سیاسی حالات و واقعات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔قیام پاکستان کے حالات و واقعات کے حوالے سے عام لوگوں کی سوچوں ،امیدوں اور آرزوؤں کی عکاسی بھی کی گئی ہے اور قیام پاکستان کے بعد ایک مسلمان گھرانے کی پاکستان کو ہجرت کے حالات و واقعات کو بھی ناول کا حصہ بنایا گیا ہے، سیاسی بیانیوں کو بھی ناول کے عمومی مزاج اور زبان و بیان کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔تقسیم ہند کے ایام کو یوں ایک بیانیے میں سمویا ہے:

> ملک کے بٹوارے کا موقع آن پہنچا تھا۔سال چڑھا تو افواہیں پھیلنی شروع ہوئیں کہ آبادی کی ادل بدل شروع ہو چکی ہے۔پھر فساد اور مار دھاڑ کی کہانیاں کانوں تک پہنچنے لگیں۔کبیر سنگھ والا میں اگرچہ مسلمانوں کا ایک ہی گھرانا تھا اور اس میں بھی اب فقط تین فرد رہ گئے تھے مگر جدی پشتی رہائش کے مقام پر ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہ تھی ۔یعقوب اعوان کو ایک پل کے لیے بھی اس بات کا

گمان نہ ہوا کہ وہ نقل مکانی کرے۔ یہاں تک کہ جلسے جلوس اور نعرے امرتسر
سے نکل کر نواح کے قصبوں اور گاؤں میں سرائیت کر آئے۔ پھر بھی سڑک پر
ہجرت کرتے ہوئے بدحال قافلے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو
آتے ہوئے نظر آنے شروع ہوئے۔ (۱۸)

تقسیم ہند اور ان کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت کی عکاسی ناول نگار نے حالات و واقعات کے پس منظر میں زبان و بیان کی اثر پزیری کے ساتھ کی ہے۔ ہجرت کے حالات کا ایک پورا ماحول اپنے جزئیات کے ساتھ قاری کی آنکھوں کے سامنے پھیل جاتا ہے۔ ہجرت سے متعلق اسی بیانیے میں حقائق کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن اس اختصار میں حقائق کی بہت وسعت اور بہت ساری تاریخی تلخیاں سموئی گئی ہیں۔

راکھ میں بھی چونکہ پاکستان کے سیاسی حالات و واقعات کو مختلف مقامات پر ناول کے بیانیوں کا حصہ بنایا گیا ہے چنانچہ اس کے زبان و بیان کا نادار لوگ سے تقابل کرنے کی خاطر ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس میں لاہور انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور پارٹی کے دیگر رہنما ٹھہرے ہوئے تھے اور مینار پاکستان پر جلسے میں جانے والے تھے۔ مصنف نے یہ منظر یوں بیان کیا ہے:

کافی بار بریزری کو جانے والے برآمدے میں کچھ لوگ بے تابی سے ٹہلتے
تھے۔ شاید حفیظ پیرزادہ، شاید شیر پاؤ شاید۔۔۔ وہاں ان میں سے بیشتر تھے
جنہوں نے کوریڈور آف پاور میں قدم رکھا۔ منسٹرز، گورنرز، ایڈوائزرز اینڈ ولمٹ
ناٹ۔ لیکن ابھی وہ منتظر تھے کیونکہ آج فیصلہ ہونا تھا۔ اس نے ان دولفظوں میں
سے کسی ایک پر نیچے آنا تھا۔ وقت ہو چکا تھا۔ ورکرز خبر دے رہے تھے کہ مینار
پاکستان کے آس پاس ایک ریکارڈ کراؤڈ جمع ہو چکا ہے اور نعرے لگا لگا کر ان
کے گلے رندہ چکے ہیں (۱۹)

اس بیانیے میں سیاسی صورتحال بیان کرتے ہوئے ایک طرف ناول نگار نے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ذوالفقار علی بھٹو کے انتظار میں برآمدے میں ٹہلتے ہوئے رہنماؤں کی بے تابی واضح کی ہے تو ساتھ ہی

ساتھ ان رہنماؤں کے نام درج کرتے ہوئے دربار شاید کا لفظ بھی درج کیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان رہنماؤں کی نشاندہی کرنا چاہتے تھے لیکن یقینی طور پر ان کے نام لینے کے بجائے اپنی یاداشتوں کو ''شاید'' کی رعایت بھی دیتے ہیں۔اصل میں اس بیانیے میں بھٹو کے علاوہ دیگر سیاسی رہنماؤں کے ناموں کے اندراج کی شاید خاص ضرورت بھی نہ تھی مگر ان ناموں کے اندراج سے ایک طرف تو بھٹو کے مقام اور مرتبے کی عکاسی ضروری تھی کہ وہ اوپر ٹھہرے ہوئے تھے اور باقی تمام رہنما نیچے ان کے انتظار میں ٹہلتے رہے۔پھر یہ کہ مصنف نے یہ بھی لکھ کر حقائق سے پردہ اُٹھایا ہے کہ ان لوگوں میں سے بیشتر وہ جنہوں نے اقتدار میں قدم رکھا۔کوئی وزیر بنا کوئی گورنر تو کوئی شیر بنا۔لاہور کے انٹر کانٹی نینٹل میں ٹھہرے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور دیگر تمام رہنما مینار پاکستان پہنچتے ہیں جہاں لوگوں کا ایک اژدھام جمع ہے اور نعرے لگا رہا ہے۔آج کے دن جو تاریخی جلسہ تھا اور اس میں جو تاریخی تقریر بھٹو نے کی۔پاکستان کی تاریخ پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔مصنف نے کھل کر بیان نہ کرنے کے باوجود مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی اکثریت،ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے اور بھٹو کی طرف سے اس کی مخالفت کی روداد بیان کردی ہے۔مصنف نے بھٹو کے تحفظات کو بھی بیان کیا ہے اور ان کی دھمکی کو بھی اس بیانیے میں سمو یا ہے۔

> ہجوم اُسے دیکھ کر بے قابو ہو رہا تھا۔اس کی جڑیں اس ہجوم میں تھیں پھر اس نے تقریر شروع کی۔اس نے بہت کچھ کیا اور جب ڈائس کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ جوش میں آکر کھڑے ہوجاتے اور نعرے لگانے لگتے تو وہ غصے میں آکر ان سے کہتا ''بے وقوف بیٹھ جاؤ''اور بے وقوف فوراً بیٹھ جاتے (۲۰)

بھٹو ایک عوامی لیڈر تھے اور عوام کے جذبات کو ابھارنے کے لیے جلسوں میں کئی طرح کے نفسیاتی حربے بھی استعمال کرتے تھے۔نعرے لگانے والوں کو چپ بھی کراتے تھے اور شاید مصنوعی غصے میں آکر لوگوں کو ''بے وقوف'' بھی کہہ جاتے تھے۔بھٹو کی زبان سے لوگوں کو ''بے وقوف بیٹھ جاؤ'' درست مگر جب مصنف اپنی طرف سے کہتا ہے کہ بے وقوف بیٹھ جاتے تو یہ بیانیہ اچھا نہیں لگتا۔لیکن پیپلز پارٹی سے متعلق سیاسی بیانیوں میں مصنف کا ذاتی سیاسی نظریہ ظاہر ہو رہا ہے۔کوئی بھی مصنف اپنی سیاسی وابستگی یا سیاست نظریے سے الگ تھلگ ہو کر کچھ تخلیق نہیں کرسکتا اور یا ناول میں جہاں سیاسی بیانیہ شامل کرنا ہو وہاں

اپنی سیاسی وابستگی کے مطابق یہ مواد شامل کرتا ہے۔ بہرحال مصنف نے اس بیانیے میں اور اس سے آگے جلسے میں بھٹو کی انتہائی متنازعہ تقریر کو عمدگی سے بیانیے کا حصہ بنایا ہے۔ ملاحظہ ہو اس بیانیے کا اگلا حصہ:

> ۔۔۔اُسے یہ اندازہ تھا کہ بھٹو ڈھاکہ میں بلائے جانے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کے بارے میں کچھ کہہ رہا ہے اور پھر اُسے کچھ اندازہ ہوا کہ وہ اس اجلاس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے اور شاید یہ بھی کہ اگر کوئی ایم این اے اس اجلاس میں شامل ہوا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ ہمیں گارنٹیز چاہئیں اور پبلک تائید کر رہی تھی کہ مجیب الرحمٰن کی رعونت اور علیحدگی پسندی کا یہی جواب تھا۔(۲۱)

اس سیاسی بیانیے میں ناول نگار نے بڑی فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ چونکہ بیانیے میں مشرقی پاکستان کے حوالے سے شیخ مجیب الرحمٰن کا سیاسی موقف اور اس پر وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا شدید ردعمل شامل ہے لہذا مصنف نے براہ راست اس موضوع پر مواد شامل کرنے کے بجائے مردان کے ذریعے بھٹو کی تقریر کا لب لباب بیان کیا ہے۔ اس بیانیے میں بہت سی نازک تاریخی باتیں دہرائی گئی ہیں کہیں تلخ حقائق کے بیان کے لیے تلخ لہجہ استعمال نہیں کیا اور نہ ہی مصنف نے اپنے سیاسی نظریے کو یوں کھل کر بیان کیا ہے کہ ان کا سیاسی نظریہ کھل کر بیانیے میں سامنے آئے۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ خود انہوں نے نہیں سنا بلکہ مردان نے سنا اور وہ بھی ایسے کہ صاف صاف اور واضح نہیں سنا کیونکہ سینکڑوں لاؤڈ سپیکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے لگے ہوئے تھے اور آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ہجوم کے شور میں مل کر لفظوں کی پہچان کو ناممکن بنا رہی تھیں۔ یہ ایک فنی خوبی ہے کہ مصنف نے اپنا سیاسی موقف اور سابق مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے حوالے سے بھٹو کے متنازعہ بیانات کو خود بیانیے میں شامل کرنے کے بجائے ایک دوسرے کردار مردان کے ذریعے بیان کر کے خود کو متنازعہ بیان کا راوی نہیں بنایا جب کہ بھٹو نے متنازعہ بیان کو اپنے بیانیے کا حصہ بنا بھی لیا۔

مستنصر حسین تارڑ کے اس ناول میں ان کے سیاسی نظریات نمایاں ہیں۔ انہوں نے کچھ تاریخی باتیں جن کا تعلق ملک کی سیاست سے ہے کو نمایاں کرنے اور اپنا سیاسی موقف بیان کرنے کے لیے ایک

منظر اور ماحول تخلیق کیا ہے جس طرح راکھ میں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت ،انداز خطابت اور سیاسی تقریر کو ایک دو بیانیوں میں پیش کیا ہے اسی طرح نادار لوگ میں بنگال کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کی شخصیت انداز خطاب اور سیاسی نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔راکھ میں بھٹو کا نام درج ہے جب کہ نادار لوگ میں نام لیے بغیر مصنف نے اس کے نظریات سے اس کا تعارف کروایا ہے۔سٹیج پر اس کے آنے اور اس کا وضع قطع اس بیانیے میں ظاہر کیا گیا ہے:

> سٹیج کے پیچھے ہلچل مچی۔نعرے بلند ہوئے اور اچانک ڈائس پر ان کا لیڈر نمودار ہوا۔وہی عام سا شلوار قمیص کا لباس، پاؤں میں چپلی ۔قمیص کے کف کھلے۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے تالی بجائی۔پھر بازو کھول دیئے جیسے سارے جہاں کو خوش آمدید کہہ رہا ہو ۔قمیص کی آستینیں ڈھلک گئیں اور کہنیوں تک بازو ننگے ہو گئے۔(۲۲)

اس لیڈر کا حلیہ اور جلسہ گاہ میں انداز خطابت بیان کرنے کے بعد مصنف نے اس کے سیاسی نظریات کو اس ہی کی زبانی بیان کیا ہے۔یہ بیان اس لیڈر کی براہ راست تقریر ہے جبکہ راکھ میں مستنصر حسین تارڑ نے بھٹو کی تقریر کو براہ راست اس کی تقریر نقل کرنے کے بجائے وہاں موجود ایک فوجی اہلکار کی زبانی بیان کیا ہے نادار لوگ کے اس سیاسی بیانیے میں مصنف نے ایک توازن برقرار رکھا ہے۔لیڈر کی سیاسی تقریر کو نقل کیا ہے لیکن اپنے تاثرات اس میں شامل نہیں کیے نہ اس کے سیاسی نظریات کی حمایت کی ہے اور نہ مخالفت لیکن بیانیے کے آخر میں ایک کردار ''اعجاز'' کی سوچ کو لفظوں میں بیان کر کے مصنف نے اپنا سیاسی نقطہء نظر پیش کیا ہے۔پہلے لیڈر کی سیاسی تقریر پر مشتمل بیانیہ ملاحظہ ہو:

> یہ ایک مداری ہے''لیڈر کہہ رہا تھا''اس کے پاس مداریوں کی کئی ٹوپیاں ہیں ایک ٹوپی پریذیڈنٹ کی ہے۔پھر اسے اتار کر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ٹوپی پہن لیتا ہے جب ضرورت محسوس کرتا ہے تو اُسے اتار کر پھینک دیتا ہے اور کمانڈر انچیف کی ٹوپی پہن لیتا ہے۔اس کے پاس ایک سیاست دان کی ٹوپی بھی ہے جب اُسے پہنتا ہے تو انتقال اقتدار کی ٹال مٹول کرنے لگتا ہے۔(۲۳)

لیڈر کی تقریر،نعرے ، لوگوں کی تالیاں اور شور شرابے کے بیان کے بعد مصنف نے اس لیڈر کے سیاسی نظریات پر اپنا تاثر بہت ہلکے انداز میں لیکن پراثر انداز میں پیش کیا ہے۔جملے میں شامل اعجاز کی سوچ کو لفظوں کا روپ دے کر مصنف نے اپنا تاثر یوں بیان کیا ہے:

اعجاز گو اس سارے عمل میں شامل تھا مگر ایک خیال کو وہ اپنے دل میں آنے
سے نہ روک سکا کہ سیاست اپنی غلط فہم خطوط پر استوار ہوتی ہے۔(۲۴)

دونوں ناولوں کے سیاسی بیانیے تاریخی حوالوں سے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ پاکستان کی سیاسی تاریخ ہے۔اس تاریخ کے اہم کرداروں کو بھی سامنے لاکر ناول کے بیانیوں میں پیش کیا گیا ہے اور ان کے سیاسی نظریات کو بھی ان کی تقاریر کے حوالے سے نمایاں کیا گیا ہے۔یہ وہی سیاسی نظریات اور رویے ہیں جنھوں نے اس ملک کی سیاست میں اس قدر تناؤ پیدا کیا کہ نہ صرف سیاست کے رُخ بدل گئے بلکہ اس کے نتیجے میں ایک پاکستانی قومیت دو قومیتوں ں میں بٹ گئی۔

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بیانیوں کا تقابلی جائزہ:

۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا مشرقی بازو مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔مشرقی پاکستان کی علیحدگی پاکستان کی قومی تاریخ کا ایک بہت بڑا اور افسوس ناک المیہ ہے۔یہ المیہ یکدم رونما نہیں ہوا اور نہ ہی بنگلہ دیش راتوں رات بن گیا تھا بلکہ اس کے سیاسی محرکات طویل عرصہ پر محیط ہیں۔مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کے سیاسی نظریات،سیاسی رویے اور سیاسی اقدامات اس طویل کرب ناک کہانی کے اہم کردار ہیں۔ انتخابات میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی بھاری کامیابی اور ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کا ڈھاکہ اجلاس میں جانے کی مخالفت نے برسوں سے پلنے والے سیاسی اختلافات کو بلندی پر پہنچا دیا۔ ناول راکھ اور نادار لوگ دونوں میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کے نظریات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اور مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن۔قیام بنگلہ دیش اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں ذمہ داران کا تعین کرنے کی خاطر بننے والے کمیشن کو بھی مختلف بیانیوں کا حصہ بنایا ہے۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے محرکات کو دونوں ناولوں میں شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو کے

جلسوں اور ان میں ان کی تقاریر کے ذریعے بیانیے کا روپ دیا گیا ہے۔ ناول راکھ میں لاہور میں بھٹو کے جلسے کی روداد بیان کی گئی ہے جو مینار پاکستان پر منعقد ہوا تھا۔بھٹو ہوٹل کے اوپر کمرے میں ٹھہرے تھے اور نیچے راہداریوں میں پیپلز پارٹی کے دیگر رہنما ان کے نکلنے کے انتظار میں بے تابی کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔بھٹو نکلے تو کار میں بیٹھ کر سیدھے مینار پاکستان گئے۔وہاں ان کی تقریر کا یہ حصہ مشرقی پاکستان کے محرکات میں سے ایک بڑے محرک کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

> اُسے یہ اندازہ تھا کہ بھٹو ڈھاکہ میں بلائے جانے والے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔اور شاید یہ بھی کہ اگر کوئی ایم این اے اس اجلاس میں شامل ہوتو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ہمیں گارنٹیز چاہئیں۔(۲۵)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے محرکات کا ایک دوسرا رُخ ''نادار لوگ'' میں پیش کیا گیا ہے۔ایک اور سیاسی کردار اور اس کے سیاسی نظریات اور مطالبات کو بیان کیا گیا ہے۔یہ شیخ مجیب الرحمٰن ہے جو ایک بڑے جلسے میں اپنے مخصوص وضع قطع میں آکر مخصوص انداز کی خطابت کا جوش دکھاتا ہے۔وہ انتقال اقتدار کا مطالبہ کرتا ہے بھٹو پر شدید تنقید کرتا ہے ۔اس کو مداری کہتا ہے ایسا مداری جو کبھی پریزیڈنٹ کی ٹوپی پہن لیتا ہے،کبھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ،کبھی کمانڈر انچیف کی اور کبھی سیاست دان کی۔سیاستدان کی ٹوپی پہن کر وہ اقتدار منتقل کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔

عبداللہ حسین نے شیخ مجیب الرحمٰن کے مطالبے کو اپنے بیانیے میں پیش کرنے کے بعد اس پر ایک تنقیدی رائے بھی دی ہے مگر یہ رائے اپنی طرف سے نہیں بلکہ وہاں موجود ایک اور کردار اعجاز کے حوالے سے اعجاز کی سوچ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> اعجاز گو اس سارے عمل میں شامل تھا مگر ایک خیال کو وہ اپنے دل میں آنے سے نہ روک سکا کہ سیاست اپنی غلط فہم خطوط پر استوار ہوتی ہے۔(۲۶)

راکھ میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں مغربی پاکستان کی سیاست کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ بھارت کی سازشوں اور فوجی مداخلت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔بھارت نے ایک طویل عرصے سے مشرقی پاکستان میں اپنی سازشوں کا آغاز کردیا تھا۔نوجوان بنگالیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ مغربی پاکستان

بنگالیوں کے حقوق سلب کر رہا ہے۔ بنگال کی پیداوار اور تجارت کا سارا فائدہ مغربی حصہ اُٹھا رہا ہے۔ جب مشرقی پاکستان میں آزادی کے مطالبے نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی تب بھی بھارت اس تحریک کی عملی مدد کرتا رہا اور جب پاکستان آرمی نے ملٹری ایکشن کیا تو لاکھوں بنگالی نوجوانوں کو بھارت نے اپنی سرزمین پر ٹریننگ اور اسلحہ دے کر پاکستان آرمی سے لڑنے کے لیے تیار کیا۔ اس ضمن میں راکھ کے اس بیانیے کا اشارہ بھی اسی حقیقت کی طرف ہی ہے:

> ان کا وزیر دفاع جگ جیون رام خود کہتا ہے کہ ہم نے ایک لاکھ تیس ہزار بنگالیوں کو پاکستانی فوج کے خلاف لڑنے کی ٹریننگ دی ہے۔ ڈاکٹر ٹریگونہ سین نے اگرتلا کے باغیوں کو باقاعدہ ایک ریڈیو ٹرانسمیٹر تحفے میں دیا۔ (۲۷)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے محرکات کئی ہیں ۔فوجی اعتبار سے بھی مشرقی پاکستان میں شاید مناسب رویہ اختیار نہیں کیا گیا تھا اسی لیے فوجی ایکشن کے خلاف مزید ردعمل بلکہ مسلح ردعمل دیکھنے کو ملا۔ بھارت سے تربیت پانے والے بنگالی نوجوان اپنی ہی فوج کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ایسی حالت میں نہ مناسب سیاسی فیصلے کیے گئے اور نہ ہی فوج نے سوائے قبضہ جمائے رکھنے کے علاوہ کوئی اور مناسب رویہ اختیار کیا۔ راکھ میں اس موضوع پر بھی بیانیے اور مکالمے ملتے ہیں۔ مردان اور کیپٹن گل ریز خان کے مابین ایسا ہی ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

> جو شخص اپنے گھر پر بلکہ جھونپڑی پر۔ رکشا یا سائکل پر قومی پرچم نہیں لگاتا۔ شوٹ دے باسٹرڈ (۲۸)

یہ مکالمہ آگے بڑھتا ہے۔ جب کیپٹن گل ریز خان ہائی کمان کی اس ہدایت پر جرت کا اظہار کرتا ہے کہ قومی جھنڈا نہ لگانے والوں کو شوٹ کر دیا جائے اور مردان سے یہ کہتا ہے کہ سر وہ مسلمان ہیں تو مردان جواب دیتا ہے کیا ہوا کیپٹن اگر مسلمان ہیں اور پھر کھُلنا بیرکس کے واقعے کے حوالے سے کہتا ہے:

> کھُلنا بیرکس کے بعد چیف اور کیا کہتا ۔کیا کرتا۔ وہ بالکل درست کہتا ہے ۔زمین چاہیئے ، بنگالی نہیں۔ (۲۹)

ناول راکھ اور نادار لوگ کے بیانیے صرف مغربی اور مشرقی پاکستان کے سیاسی اور فوجی خیالات و

نظریات پر مبنی ہی نہیں ہیں بلکہ نادار لوگ میں اس کمیشن کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جو مشرقی پاکستان کے محرکات کی تحقیق کرنے اور نتائج مرتب کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔ناول میں کمیشن کا نام لیے بغیر لکھا گیا ہے کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سمیت تین اعلیٰ ترین ججوں پر مشتمل ایک کمیشن آف انکوائری مقرر کی گئی۔دراصل یہ حمود الرحمٰن کمیشن تھا جس نے انکوائری بھی کی اور اپنی تفصیلی رپورٹ بھی مرتب کی لیکن اس رپورٹ کو عام نہیں کیا گیا۔نادار لوگ میں کمیشن کی رپورٹ کے بعض نکات کو شامل کیا گیا ہے۔اصل میں اس رپورٹ کے بعض حصے چوری سے آؤٹ کیے گئے اور بھارت میں شائع بھی ہوئے۔عبدالرحمٰن نے اس کمیشن کی رپورٹ کے ایک حصے کو اپنے بیانیے میں یوں پیش کیا ہے:

> اپنی تفتیش اور تحقیق کے نتیجے کے طور پر کمیشن اس فیصلے پر پہنچی کہ یہ محض ایک عسکری شکست نہ تھی بلکہ ایک عظیم سیاسی اور اخلاقی ہار تھی۔دو مارشل لاؤں کے دوران پاکستان کے فوجی حکمران اخلاقی طور پر اس قدر گر چکے تھے اور اتنے بدعنوان ہو چکے تھے کہ ان میں جنگ لڑنے کی سکت نہ رہی تھی۔(۳۰)

کمیشن کی رپورٹ کو مزید زیر بحث لاکر عبداللہ حسین لکھتے ہیں کہ فوجی حکمرانوں کی یہ اخلاقی گراوٹ اس وقت شروع ہوئی تھی جب سینئر افسران ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کی انتظامیہ میں ملوث ہوگئے اور پھر جب ۱۹۶۹ء میں یحییٰ خان نے دوسرا مارشل لاء لگایا اور فوجی افسران کاروبار حکومت میں شامل ہو گئے تو ان کی اخلاقی گراوٹ اور بدعنوانی میں مزید اضافہ ہوا۔مشرقی پاکستان کے حالات اس وقت خراب ہوئے جب یحییٰ خان نے وہاں ملٹری ایکشن شروع کیا۔کمیشن کے سامنے بعض گواہوں کے بیانات کے اقتباسات بھی نادار لوگ میں شامل کیے گئے ہیں۔مثلاً :محمد اشرف جو سقوط ڈھاکہ کے زمانے میں ڈھاکہ کا ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر تھا،نے کمیشن کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ''مشرقی پاکستان کے لوگ اپنے ہی ملک کے اندر اجنبی بنا دیئے گئے تھے۔بریگیڈیئر اقبال الرحمٰن شریف نے بیان دیا کہ ''جنرل گل حسن اپنے جوانوں سے پوچھا کرتا تھا کہ تم نے کتنے لوکل آدمی مارے ہیں'' ایک اور گواہ نے کمیشن کے روبرو یہ انکشاف کیا کہ جنرل اے کے نیازی نے مشرقی پاکستان کے کمانڈر کا عہدہ سنبھالتے ہی ماتحت فوجیوں سے کہا کہ یہ دشمن کا علاقہ ہے۔جو اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو۔برما میں ہم یہی کیا کرتے تھے۔بعض فوجی افسران نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ''سات سینئر افسران اور ان کی یونٹیں وسیع پیمانے پر لوٹ مار میں ملوث تھیں اس لوٹ مار میں نیشنل بنک کی سراج گنج

برانچ سے ایک کروڑ ۳۷ لاکھ روپے کی چوری بھی شامل تھی۔

عبداللہ حسین نے کمیشن کی سفارشات میں سے سات سفارشات کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے۔ان میں سفارش نمبر ایک میں جنرل یحیٰی خان اور ان دیگر فوجی افسران کے خلاف کھلا مقدمہ چلانے کی تجویز ہے جنہوں نے ۱۹۶۹ء کو مجرمانہ سازش کر کے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے غیر قانونی طور پر اقتدار چھینا تھا۔ نیز ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی میں جانے سے سیاست دانوں کو روکنے کے لیے دھمکی اور لالچ کے حربے استعمال کیے تھے۔ سفارش نمبر ۲ میں جنگی فرائض میں غفلت برتنے والوں کے خلاف مقدمہ چلانے اور سفارش نمبر ۳ میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کورٹ آف انکوائری مقرر کرنا شامل ہے۔سفارش نمبر ۴،۵،۶ میں بعض فوجی افسران کے خلاف کاروائی کی تجویز شامل ہے۔

ناول راکھ اور نادار لوگ کے مختلف بیانیے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سیاسی محرکات کے ساتھ ساتھ فوجی محرکات پر بھی مبنی ہیں۔ یہ بیانیے ظاہر کرتے ہیں کہ دونوں ناول نگار اس عظیم قومی سانحے پر تحقیقی سطح پر رنجیدہ ہیں اور اس سانحے کا لمحہ لمحہ ان کی تخلیقی فکر کو متاثر کر رہا ہے۔

پاکستان میں مہاجرین کو درپیش مسائل کا جائزہ:

ناول راکھ اور نادار لوگ دونوں میں تقسیم ہند کے حالات و واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔تقسیم کے وقت کے فسادات اور املاک کی تباہی اور انسانی جانوں کے بے رحمانہ قتل و غارت کے ساتھ انسانی آبادی کی پاکستان اور بھارت کو منتقلی کے مناظر اور واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ بھارت سے پاکستان آنے والے مہاجرین کو پاکستان میں کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔مہاجرین کی ایک بڑی تعداد بھارت میں اپنی زمینیں ،باغات،مکانات اور دکانیں چھوڑ کر آئے تھے لیکن یہاں ان کو زمینوں اور مکانات کے حصول میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔اسی طرح یہاں سے جانے والوں کو بھی اپنی املاک سے ہاتھ دھونا پڑا اور بھارت جا کر ان کو بھی ایسے ہی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔

نادار لوگ میں امرتسر کے گاؤں کبیر سنگھ والا سے ہجرت کر کے آنے والا یعقوب اعوان اپنی بارہ کلے زمین چھوڑ کر آیا تھا لیکن یہاں اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔جائز طریقے سے یہاں مکان اور زمین حاصل کرنا دشوار تھا جب کہ ناجائز قبضوں کا سلسلہ جاری تھا۔چند افراد مل کر ایک جتھے کی شکل میں جا کر کوئی بھی

زمین اپنے قبضے میں لے لیتے تھے لیکن یعقوب اعوان جیسے لوگوں کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔اس صورتحال کو نادار لوگ کے کئی مکالموں اور بیانیوں میں واضح کیا گیا ہے جیسے ذیل کے مکالموں سے ظاہر ہوتا ہے:

> میری ساڑھے بارہ کلے زمین ہے۔یعقوب اعوان نے کہا اوئے بے عقلے، ہے کہاں؟ وہ تو اُدھر رہ گئی۔(۳۱)

اپنی زمینیں اور مکانات چھوڑ کر آنے والوں کو یہاں اپنے کاغذات اٹھا کر مہاجرین کے محکمے کے چکر لگانے پڑتے تھے۔با آثر لوگ محکمہ کے اہلکاروں کے ساتھ مل کر اور رشوت دے کر بڑے مکانات اور زمینیں حاصل کر لیتے جبکہ عام لوگ مہینوں دھکے کھاتے رہتے تھے۔شیر بہادر اور اعجاز جو یعقوب اعوان کے متعلق بات کر رہے تھے۔کے مابین یہ مکالمہ ملاحظہ ہو جو ساری صورتحال کو خوب نمایاں کرتا ہے:

> جھتا بنا کر جائیں گے۔زمین پر بشن داس کے کمی بیٹھے ہیں انہیں ڈرا دھمکا کر دوڑا دیں گے اور قبضہ کر لیں گے۔ساری دنیا کر رہی ہے۔زمین تو مہاجرین کے محکمے کی ہے۔اعجاز نے کہا یکوب مہاجر نہیں تو کیا ہے۔تین مہینے سے بارہ کلے کے کاغذ لے کر پھر رہا ہے۔کیا ملا اس کو۔ہم کہتے ہیں کلے ولے چھوڑ۔عرضی نویس کو پچاس روپے چڑھا تو کلے کی جگہ مربعے لکھ دے گا۔(۳۲)

پاکستان چھوڑ کر بھارت منتقل ہونے والے ہندوؤں کی زمینیں، مکانات اور دکانیں ادھر آنے والے مہاجرین کو دینے کے ساتھ ساتھ یہاں ملی بھگت سے اپنے نام کرنے کے طریقے بھی نکال لیے گئے تھے۔صاحب اختیار لوگ متروکہ اراضی اپنے نام کر لیتے تھے۔با اختیار اور صاحب ثروت مہاجرین کے محکمے کے ساتھ مل کر غیر قانونی طور پر یہ املاک ہتھیا رہے تھے۔ملک جہانگیر بھی ایسا ہی ایک کردار ہے جو علاقے کا ایم ایل اے تھا اور جس نے متروکہ اراضی اپنے نام کر لی تھی:

> ملک جہانگیر اعوان ملک فلک شیر کا بہنوئی اور علاقے کا ایم ایل اے تھا۔اس نے بھی فلک شیر کی اعانت سے مزید بارہ مربعے متروکہ اراضی کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا تھا۔(۳۳)

جو لوگ پاکستان چھوڑ کر بھارت جا رہے تھے ان کی املاک پر بھی قبضے شروع ہو چکے تھے۔نہ صرف لوگوں

کے جانے کے بعد ان کی متروکہ املاک پر قبضے جمائے گئے بلکہ ان کی موجودگی ہی میں ان کو ہتھیانے کی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔

> رائے بہادر شمشیر سنگھ جی کی موجودگی ہی میں ایک مقامی شخص نے جعلی کلیم داخل کر کے ان کے لارنس روڈ والے وسیع مکان پر قبضہ جما لیا تھا۔اپنے اثر ورسوخ کے باوجود رائے بہادر صاحب قبضہ واپس لینے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ (۳۴)

بعض لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بھارت اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ ممالک کی صورت میں وجود میں آ چکے ہیں ۔لہٰذا، ہندو پاکستان چھوڑ کر بھارت جا رہے تھے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے آبائی علاقوں کی جائیدادیں چھوڑ کر پاکستان آ رہے تھے لیکن اپنی زمین اور مکان سے محبت انسان کی سرشت میں ہوتی ہے لہٰذا اس کو چھوڑنے کے لیے کوئی بھی آسانی کیساتھ تیار نہیں ہوتا۔ناول راکھ میں اس انسانی سرشت کا ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔شاہ عالمی مارکیٹ میں آتشزدگی کے بعد اور آبادی کی تباہی کے بعد بھی ایک ہندو بندو رام اپنے تباہ حال گھر کے دروازے کے سامنے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہوتا ہے:

> بندو رام اسی گلی میں ایک ٹوٹی کھٹارا چارپائی پر بیٹھا حقہ پیتا رہتا تھا۔صرف ایک دھوتی میں ملبوس ۔اور بندو رام تم تو ہندو ہو تو پھر ہندوستان کیوں نہیں جاتے اور وہ اپنے تمباکو کے زردہ والے دانتوں کے ساتھ ہنسنے لگتا۔اوئے یہ میرے گھر کا دروازہ ہے۔میں تو اس کے اندر بھی نہیں جا سکتا ہندوستان کیسے جاؤں۔ (۳۵)

راکھ میں ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مہاجرین کی بے بسی کا اظہار خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔بھارت میں اپنے مکانات چھوڑ کر پاکستان آنے والوں کو ایک مکان ملنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔بے سروسامانی کی حالت میں آنے والے یہاں بھی بے سرو سامانی کی حالت میں دردر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ہجرت کر کے آنے والے ان مسلمانوں کو پناہ گیر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا جو ایک نامناسب نام تھا۔یہ وہ لوگ تھے جو بقول مصنف جو ہزاروں برسوں سے اپنے ایک علاقے میں رہا کرتے تھے۔وہاں کی نسلوں کی نسلیں قبرستانوں میں دفن ہوئیں۔ان گھروں سے ایک تنکا اٹھائے بغیر یہ لوگ اپنے گھروں سے نکلے۔بھوکی ننگی مائیں اپنے بچوں کو ننگا دیکھتی رہیں۔کرپانوں میں بچوں کو پروتے ہوئے دیکھتی رہیں۔اتنے

مصائب اٹھا اٹھا کر ان لوگوں کی عجیب شکلیں بن گئی تھیں۔ ان مہاجرین کی بے سروسامانی اور ایک مکان کے حصول کے لیے در بدر پھرنے کی روداد بھی مصنف نے بیان کی ہے کہ مہاجرین صبح کے وقت گوالمنڈی میں واقع چوہدری اللہ داد خان کے گھر کے باہر جمع ہو جاتے جو مہاجرین کو مکانات الاٹ کرنے کے ذمہ دار تھے۔ لیکن ایسے بھی ہزاروں تھے جو کھلے آسمان تلے بے سروسامانی پڑے تھے۔ اس ضمن میں یہ بیانیہ ملاحظہ ہو:

> اکتوبر کے آغاز میں ہوا یکدم سرد ہوگئی۔ والٹن کیمپ اور لاہور سٹیشن کے اردگرد لاکھوں لوگ بے سروسامانی پڑے تھے۔ (۳۶)

مصنف نے مہاجرین کو مکان الاٹ کرنے والے اللہ داد خان کا ان مہاجرین کے پاس آنے اور دست سوال دراز کرنے کا بھی ذکر کیا ہے جن کو اس نے مکان الاٹ کیے تھے۔ اللہ داد ان سے کہتا کہ آپ کے پاس تو چھت ہے آپ کوئی کمبل، رضائی یا تلائی ان مہاجرین کے لیے دیجئے جو ننگے آسمان تلے کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایسے کربناک بیانیے ہیں کہ جن کو پڑھ کر ہر پاکستانی کا دل غم سے اور آنکھیں بھر جاتی ہیں ۔کیسے کیسے مصائب تھے جو ان مہاجرین نے ہجرت کے دوران اٹھائے اور پھر پاکستان کے مہاجر کیمپوں میں پہنچ کر بھی ان کو جن مصائب سے گزرنا پڑا وہ نہایت کربناک ہیں۔

پاکستان ملٹری اور بیوروکریسی سے متعلق آرا کا جائزہ:

ناول راکھ اور نادار لوگ کے کئی بیانیوں میں پاکستان کی افواج اور سول بیوروکریسی سے متعلق آرا و خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ چونکہ دونوں ناول پاکستان کی سیاسی تاریخ کو زیر بحث لاتے ہیں چنانچہ افواج کے عسکری کردار کے ساتھ ساتھ اس کے سیاسی کردار کو بھی مختلف حوالوں سے بیان کیا گیا ہے۔ دونوں ناول نگار نہ تو فوج کے سیاسی کردار کی حمایت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے عسکری کردار سے مطمئن ہیں۔ خاص طور پر سانحہء مشرقی پاکستان کے حوالے سے دونوں ناولوں میں فوج کے کردار پر تنقید کی گئی ہے۔

راکھ میں مشرقی پاکستان میں فوج کے غیر زمہ دارانہ رویے کو بہت ہی کربناکی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کرنل خان مسلمان بنگالیوں کو ہندو سمجھ کر بے گناہ فائر کر کے قتل کرتا ہے۔ اس کرنل اور اس کے ساتھ میجر کا یہ مکالمہ اس غیر ذمہ دارانہ رویے کو خوب نمایاں کرتا ہے:

> کرنل خان صرف پچھلے ہفتے ڈھاکہ پہنچے تو آفٹر نون میں انہوں نے شہر کا ایک

راؤنڈ کیا۔واپسی پر انہوں نے کہا کہ یار اُدھر تو میں جدھر گیا اُدھر ہندو مندو ہے۔دھوتی موتی میں ۔یارا میں نے ایک برسٹ چار پانچ ہندومندو مار دیا۔توادھر نٹ میس میں ایک میجر تھا ۔وہ کہنے لگا کرنل صاحب ادھر سب مسلمان ہے اور جن کو آپ نے برسٹ مارا ہے وہ بھی شاید مسلمان تھے تو کرنل بہت ہنسا اور کہنے لگا دیکھ میجر ۔کرنل خان کے سامنے اگر کوئی ٹہنی کے موافق دھوتی پہن کر پھرے گا تو یارا بس ہندو مندو ہوگا۔ (۳۷)

ناول کے اسی حصے میں اگلے منظر میں کیپٹن مردان خان چند فوجی جوانوں کے ساتھ راؤنڈ پر تھا کہ جنگل کے اختتام پر تالاب کے کنارے جھاڑیوں میں کچھ موومنٹ ہوئی۔جوانوں نے جا کر دیکھا اور تین زرد چہروں والے دھوتی پوش نوجوانوں کو پکڑ کر لائے۔صوبیدار اللہ یار نے ان کو مکتی باہنی کے جوان قرار دیکر کیپٹن سے ان کو شوٹ کرنے کی اجازت چاہی۔کیپٹن نے ان کو چیک کرنے کو کہا اور پھر ان کو شوٹ کرنے کا حکم دیا۔پاکستان آرمی سے متعلق ایسے بیانیے راکھ میں مختلف مقامات پر پائے جاتے ہیں۔مشرقی پاکستان میں پاکستان کے حامی افراد میں ایک مولوی احتشام الدین تھے۔ان کی پاکستانیت اور پاک آرمی کے کردار کے حوالے سے راکھ کا یہ بیانیہ دیکھیئے:

مولوی احتشام الدین اب بھی اپنے پاکستانی مسلم عقیدے پر قائم تھا لیکن اُسے ہم وطنوں کے جلتے ہوئے جسموں کی بُو بہت پریشان کرتی تھی۔گاؤں میں لوگ اعتراض کرتے تھے۔ پاکستانی فوجی ۔ادھر نہیں آنے کا۔احتشام الدین ۔۔۔۔بچرز ۔ان کو صرف زمین چاہیئے ۔(۳۸)

ناول نگار کا خیال ہے کہ پاک آرمی نے مشرقی پاکستان کو اپنا ملک اور وہاں کے مسلمانوں کو اپنے ہم وطن سمجھ کر حالات پر قابو پانے کی بجائے سارے مسلمان بنگالیوں کو دشمن تصور کر لیا تھا۔لوگوں کو قابو میں لانے کے بجائے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ صرف اس خطہ زمین کو قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں۔پاک آرمی کے خلاف ''مکتی باہنی'' کے بنگالی نوجوانوں کو بھی شوٹ کرلیا جاتا تھا۔صفحہ ۵۸۰ پر اس صورتحال کو واضح کرنے کی خاطر لکھتے ہیں: ''اگر کوئی مکتی باہنی یا کوئی بھی ماخدوش لرزتا ہوا دھوتی پوش سایہ جو شاخوں کو ہٹاتے یکدم سامنے

آجاتا اور بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ اگر اُسے ان دی سپاٹ شوٹ کرتے تو گردن سے پکڑ کر واپس لے آتے اور پھر شوٹ کر دیتے''

نادار لوگ میں بھی مشرقی پاکستان کے حوالے سے پاک آرمی کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اور نہ صرف مشرقی پاکستان میں فوج کی شکست کو بلکہ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے مختلف ادوار میں فوج کی اخلاقی حیثیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔۱۹۵۸ء کے پہلے مارشل لاء اور ۱۹۶۹ء کے دوسرے مارشل لاء کے دوران اور اس کے پورے درمیانی عرصے کو فوجی حکمرانوں کی اخلاقی تباہی کا دور قرار دیا گیا ہے۔یہ بیانیہ اور اس کے پورے درمیانی عرصے کو فوجی حکمرانوں کی اخلاقی تباہی کا دور قرار دیا گیا ہے۔یہ بیانیہ ملاحظہ ہو:

> ۔۔۔یہ اخلاقی گراوٹ اس وقت شروع ہوئی جب سینئر افسران انیس سو اٹھاون کے مارشل لاء کی انتظامیہ میں ملوث ہوگئے۔اس صورتحال نے اس وقت انتہائی شکل اختیار کر لی جب مارچ انیس سو انہتر میں جنرل یحیٰ کان نے دوسرا مارشل لاء نافذ کر دیا (۳۹)

عبداللہ حسین نے سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے قائم ہونے والے کمیشن میں پیش ہونے والے گواہوں کے بیانات کو بھی اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ان بیانات می فوجی افسران کے غیر ذمہ دارانہ رویوں کو نمایاں کیا گیا ہے مثلاً کہ مشرقی پاکستان کے اندر اپنے ہی ملک کے لوگوں کو اجنبی بنا دیا گیا ہے۔فوجی افسران اپنے ماتحتوں سے استفسار کرتے کہ آج کتنے بنگالیوں کو مار ڈالا ہے۔آرمی والے لوٹ مار کرتے رہتے اور خود جنرل نیازی نے کہا کہ جو اُٹھا سکتے ہو اُٹھالو۔کمیشن نے جو سفارشات مرتب کی تھیں ان میں سے سات اہم سفارشات کو بھی ناول میں شامل کیا گیا ہے ان سفارشات میں ان فوجی افسران کے نام بھی شامل کیے گئے ہیں جنہوں نے مجرمانہ سازش کر کے ۱۹۶۹ء میں ایوب خان سے غیر قانونی طور پر اقتدار چھینا اور جنرل یحیٰ خان کے سپرد کیا تھا۔فوجی افسران کے اسی گروہ پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ دھمکی اور لالچ کے حربے استعمال کر کے سیاسی جماعتوں پر اثر انداز ہوا تا کہ انتخابات کا نتیجہ ان کی مرضی کے مطابق برآمد ہو۔بعد میں ایسے ہی حربوں کے ذریعے سیاسی جماعتوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ڈھاکہ میں ہونے والے

قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہ ہوں مزید یہ کہ ان ہی فوجی افسران نے آپس میں مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہاں پر سول نافرمانی کی تحریک اُٹھے۔ان افسران پر مقدمہ چلانے کی سفارش بھی کمیشن نے کی تھی۔ان کے علاوہ بھی بہت سے فوجی افسران کے نام ناول میں شامل ہیں جن پر مقدمہ چلانے کی سفارش کمیشن نے کی تھی۔

ناول میں سانحہ مشرقی پاکستان کو ایک عظیم المیے کے طور پر نمایاں کر کے اس پر شدید دکھ اور قوم کے کرب کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔اس سانحے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شکست کے احساس کو بھی اس بیانیے میں اجاگر کیا گیا ہے:

> جنگ میں شکست کے احساس نے قوم کے دل کو شکنجے میں جکڑ درکھا تھا نہ شکنجہ ڈھیلا ہوتا تھا نہ جذبات کو نکاس کا راستہ ملتا تھا ایک صم بکم کی کیفیت تھی جس نے اسے موضوع ممنوعہ کی حیثیت دے دی تھی۔(۴۰)

عبداللہ حسین نے اس فوجی شکست کے نتیجے میں قوم کے دلوں کے ہار جانے پر بھی دکھ کا اظہار کیا ہے۔قوم کو جنگوں میں کبھی ہار ہوئی تھی اور کبھی جیت مگر شکست کا احساس نہیں ہوا تھا اور نہ کبھی ہمت ٹوٹی تھی لیکن مشرقی پاکستان میں فوج کی ہار سے قوم میں شکست کا احساس پیدا ہوا۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ اور عبداللہ حسین کا ناول نادار لوگ نہ صرف ایک ہی زمانے میں منظر عام پر آئے بلکہ ان دونوں کا تاریخی پس منظر اور زمانہ بھی تقریباً ایک سا ہے۔دونوں میں قیام پاکستان کے وقت کے سیاسی و سماجی حالات،فسادات اور قیام کے بعد مہاجرین کے مسائل اور پاکستان کے مسائل مشترک ہیں۔دونوں ناول نگاروں کے بیانیے مختلف ہیں لیکن پس منظر ایک ہے۔

نادار لوگ میں پاکستانی معاشرہ نمایاں ہے۔ناول کے بیانیوں میں محبت،سیاست اور تاریخ کے واقعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو مختلف بیانیوں میں مختلف حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔راکھ میں بھی ملک کی سیاسی زندگی کے کئی پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔ناول ہمارے ملک کی پچاس سالہ زندگی کے عروج و زوال کے مختلف مراحل کو ظاہر کرتا ہے۔

آزادی کے وقت کی مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترک سماجی زندگی کو دونوں ناول نگاروں نے مختلف

بیانیوں میں نمایاں کیا ہے۔راکھ میں لکشمی منشن میں مسلمانوں، پارسی ،ہندو اور سکھوں کی مشترک معاشرت دکھائی گئی ہے۔جب کہ نادار لوگ میں امرتسر کے نواح میں کبیر سنگھ والا گاؤں میں سکھوں کی آبادی میں صرف ایک مسلمان گھرانے کی پر امن زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔دونون ناول نگاروں نے متحدہ ہندوستان کی سماجی زندگی کو غیر جانبداری سے بیان کیا ہے ۔اسی طرح تقسیم ہند کے دوران فسادات کے واقعات کو بھی دونوں ناول نگاروں نے غیر متعصّبانہ انداز میں بیان کیا ہے۔دونوں ناول نگاروں نے مذہب اور وطن کی محبت سے زیادہ تمام حقائق کو انسانی حوالے سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ایسے بیانیوں سے دونوں ناول نگاروں کی غیر جانبداری اور تاریخ کی گہرائی تک رسائی کا پتہ چلتا ہے۔

تقسیم کے وقت فسادات کی منظر کشی دونوں ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز اور اسلوب میں کی ہے۔نادار لوگ میں فسادات،تباہی اور بربادی کے مناظر راکھ کے مقابلے میں کم مگر اثر کے لحاظ سے پر اثر ہیں۔نادار لوگ میں انسانی مصائب و مشکلات کو ضرور نمایاں کیا گیا ہے لیکن فسادات میں انسانی تباہی اور املاک کی ایسی بربادی نہیں دکھائی گئی جو راکھ میں ہے ۔راکھ میں ہندو مسلم اقوام کی تباہی کو بیان کیا گیا ہے۔

دونوں ناولوں میں فسادات کو سچائی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔فسادات سے متعلق بیانیے حقیقت پسندی کا ثبوت ہیں۔راکھ میں شاہ عالمی کی تباہی کے دوران جیالوں کو اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے دکایا گیا ہے کہ یہاں لال مسجد کو آگ نے چُھوا تک نہیں تھا لیکن مصنف اس بیانیے میں یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ شاہ عالمی چوک میں مندر بھی آگ سے بچ گیا تھا۔

ایسی ہی حقیقت پسندی نادار لوگ میں بھی نمایاں ہے۔کبیر سنگھ والا گاؤں میں جگت سنگھ اور جسونت سنگ ایک یہ مسلمان گھرانے کو بلوائیوں سے بچانے کی خاطر یعقوب اعوان کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔

دونوں ناولوں میں پاکستان کے سیاسی شب و روز کو مختلف بیانیوں میں قلم بند کیا گیا ہے۔راکھ میں پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت اور ایک جلسے کا منظر بیان کیا گیا ہے تو نادار لوگ میں بگال کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کی شخصیت ،انداز خطاب اور سیاسی نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بھی دونوں ناول نگاروں کے سیاسی بیانیے یکساں ہیں۔دونوں ناولوں میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کے نظریات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اور مشرقی پاکستان میں ملٹری

ایکشن اور قیام بنگلہ دیش کے حالات و واقعات بھی بیانیوں کا حصہ ہیں نادار لوگ میں اس کمیشن کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے محرکات جاننے اور ذمہ داروں کا تعین کرنے کی خاطر بنایا گیا تھا۔

دونوں ناولوں میں پاکستان کی بیوروکریسی اور افواج سے متعلق بیانیے شامل ہیں۔دونوں ناول نگار نہ تو فوج کے سیاسی کردار کی حمایت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے عسکری کردار سے مطمئین ہیں،خاص طور پر سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے دونوں ناول نگاروں نے فوج کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔راکھ میں مشرقی پاکستان میں فوج کے افسران کے غیر ذمہ دارانہ رویے کو بہت کرب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔جیسے کرنل خان مسلمان بنگالیوں کو ہندو سمجھ کر بے گناہ قتل کر دیتا ہے۔نادار لوگ میں بھی مشرقی پاکستان کے حوالے سے آرمی کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔نہ صرف مشرقی پاکستان میں فوج کی شکست کو بلکہ پاکستان کی تاریخ کے مختلف ادوار مین سیاست میں فوج کی مداخلت اور فوج کی اخلاقی حیثیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔راکھ کی طرح نادار لوگ میں بھی مشرقی پاکستان میں فوج کے بعض افسران کے غیر مناسب رویے کو نمایاں کیا گیا ہے۔جیسے:فوجی افسران اپنے ماتحتوں سے استفسار کرتے کہ آج کتنے بنگالیوں کو مارا ہے۔آرمی والے لوٹ مار کرتے رہے اور خود جنرل نیازی نے کہا کہ جو اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو۔

دونوں ناول نگاروں نے سانحہ مشرقی پاکستان کو ایک عظیم سانحے کے طور پر رقم کیا ہے۔ملک کے سیاسی حالات کے حوالے سے دونوں ناول نگاروں نے سیاسی مدوجزر کی تہہ میں اتر کر حقائق تلاش کیے اور بیان کیے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ عبداللہ حسین، *ناداراوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص ۴۶

۲۔ ایضاً ص ۴۶

۳۔ مستنصر حسین تارڑ، *راکھ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱)، ص ۶۳

۴۔ ایضاً ص ۶۲

۵۔ ایضاً ص ۱۴۷

۶۔ ایضاً ص ۶۷

۷۔ ایضاً ص ۱۰۰

۸۔ عبداللہ حسین، *ناداراوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص ۹۰

۹۔ ایضاً ص ۶۸

۱۰۔ ایضاً ص ۶۹

۱۱۔ مستنصر حسین تارڑ، *راکھ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱)، ص ۴۷

۱۲۔ عبداللہ حسین، *ناداراوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص ۷۰

۱۳۔ مستنصر حسین تارڑ، *راکھ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱)، ص ۱۱۸

۱۴۔ ایضاً ص ۱۰۱

۱۵۔ ایضاً ص ۱۰۵

۱۶۔ ایضاً ص ۲۳۹

۱۷۔ ایضاً ص ۱۱۸

۱۸۔ ایضاً ص ۶۶

۱۹۔ ایضاً ص ۴۲

۲۰۔ ایضاً ص ۴۴

۲۱۔ ایضاً ص۴۴

۲۲۔ عبداللہ حسین، *ناداراوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص۴۲۷

۲۳۔ ایضاً ص۴۲۸

۲۴۔ ایضاً ص۴۲۸

۲۵۔ مستنصر حسین تارڑ، *راکھ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱)، ص۴۴

۲۶۔ عبداللہ حسین، *ناداراوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص۴۲۸

۲۷۔ مستنصر حسین تارڑ، *راکھ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱)، ص۴۸۴

۲۸۔ ایضاً ص۳۷۹

۲۹۔ ایضاً ص۳۷۹

۳۰۔ عبداللہ حسین، *ناداراوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص۳۷۷

۳۱۔ ایضاً ص۸۵

۳۲۔ ایضاً ص۸۵

۳۳۔ ایضاً ص۸۵

۳۴۔ ایضاً ص۱۰۳

۳۵۔ مستنصر حسین تارڑ، *راکھ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱)، ص۱۰۱

۳۶۔ ایضاً ص۱۰۶

۳۷۔ ایضاً ص۱۵۳

۳۸۔ ایضاً ص۴۸۰

۳۹۔ عبداللہ حسین، *ناداراوگ* (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹)، ص۳۷۷

۴۰۔ ایضاً ص۴۵۳

ماحصل

بیانیہ بیان کے قرینے اور طریقے کا نام ہے۔بیانیے افسانوی بھی ہوتے ہیں اور غیر افسانوی بھی۔غیر افسانوی بیانیوں میں سیاسی ،معاشی ،تجارتی اور تعلیمی وغیرہ شامل ہیں جب کہ افسانوی بیانیے افسانہ،ناول اور داستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ناول میں چونکہ ایک طویل کہانی یا کہانیوں کا تسلسل ہوتا ہے لہٰذا اس میں بیانیوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔افسانوی بیانیے سے مراد بیان کا وہ طریقہ جو ایک کہانی کار اپنی کہانی میں استعمال کرتا ہے۔افسانوی بیانیے کے کئی طریقے ہیں مثلاً کہانی بیان کرنے والا خود اس کہانی کا کردار ہوتا ہے۔وہ کہانی کے ایک کردار کی حیثیت سے اپنی بات بیان کرتا ہے۔اس کے علاوہ بیانیے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ کہانی بیان کرنے والا خود کہانی کا کردار نہیں ہوتا۔وہ کہانی میں شامل نہیں ہوتا بلکہ ایک تیسرے فرد کی حیثیت سے صرف کہانی بیان کرتا ہے۔ ایک اور صورت بھی بیانیے کی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ کہانی کار خود کہانی بیان نہیں کرتا بلکہ کہانی کا کوئی حصہ کسی دوسرے شخص کے حوالے سے سناتا ہے یعنی فلاں نے کہا یا بتایا۔

کہانی کے مختلف بیانیوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔بیانیوں کا یہی تسلسل کہانی کے مختلف واقعات کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔کئی جزوی واقعات کو کہانی کی مرکزی رو میں شامل کرتا ہے۔مختلف بانیے مل کر کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔اسی تسلسل کے بارے میں ممتاز شیریں نے کہا ہے کہ ''بیانیہ صحیح معنوں میں کئی واقعات کی ایک داستان ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے علی الترتیب بیان ہوتے ہیں۔

ایک کہانی کار اپنے بیانیے میں کسی واقعے کو مختلف کرداروں،کرداروں کے مکالموں یا مناظر کے ذریعے پیش کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے داخلی خود کلامی کا سہارا بھی لے سکتا ہے جس کو انگریزی تنقیدی ادب میں Inter Monologue کا نام دیا گیا ہے۔ بیانیہ کو ایک مصنف سیدھے سادھے بیانیہ انداز میں بھی پیش کرتا ہے اور پسندانہ انداز میں بھی پیش کرتا ہے۔سیدھے انداز میں رومانوی اور حقیقت پسندانہ قسم کے بیانیے پیش کیے جاتے ہیں جب کہ علاقائی بیانیے زیادہ تر نفسیاتی پہلو لیے ہوتے ہیں۔

ناول میں چونکہ ایک طویل کہانی ہوتی ہے اور یہ طویل کہانی مختلف واقعات اور ان سے متعلق بیانیوں پر مشتمل ہوتی ہے لہٰذا ناول کا سارا تانا بانا افسانوی بیانیوں سے تیار ہوتا ہے۔مختلف ناقدین فن نے

بیانیوں کی نوعیت پر بحث کر کے ان کی اقسام کو نمایاں کیا ہے جیسے گوپی چند نارنگ نے بیانیے کے لیے ماضی کے کسی واقعہ کو لازم ٹھہرایا ہے۔ان کا خیال ہے کہ حال اور مستقبل کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بیان ہے بیانیہ نہیں کہلائے گا۔شمس الرحمٰن فاروقی نے بیانیے کے لیے واقعات کے فرضی ہونے کو لازم قرار نہیں دیا۔اس کے ساتھ ساتھ وہ فلم،ڈرامہ اور رقص وغیرہ میں بھی بانیے کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ان میں کہیں بیانیہ کم ہوسکتا ہے اور کہیں زیادہ لیکن کرداروں کی حرکات وسکنات کے ذریعے بھی کئی طرح کے بیانیے ہی پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک مغربی نقاد لیوتار بیانیے کی اہمیت کے سلسلے میں علم کو دو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک کو سائنسی علم کا نام دیتے ہیں اور دوسرے کو بیانیہ،ان کا کہنا ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی اور یلغار کے باوجود بیانیہ کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ بیانیہ صدیوں پر پھیلی ہوئی روایت ہے جس میں متھ،دیومالا،اساطیر اور قصے کہانیاں شامل ہیں۔

ایک اور مغربی ادیب فریڈرک جیمز نے بیانیے کی اہمیت کو یہ کہ کر نمایاں کیا ہے کہ ہم دنیا کو بیانیے ہی کے ذریعے جانتے ہیں اور اصل میں فریڈرک اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہزاروں سال پرانی روایت ہم تک قصے،کہانی اور لوک روایت کے ذریعے پہنچتی ہے اور یہی بیانیہ ہے۔کہانی کو بیان کرنے کے نت نئے اسالیب نے بیانیے کو بھی متاثر کیا ہے۔ساختیاتی مفکر ژیرارژینت (Gerard Genette) نے لکھا ہے کہ نئے فکشن کے آتے آتے بیانیہ مصنف کے اپنے ڈسکورس میں دوب گیا۔فکشن میں قصہ کی بجائے کردار نگاری پر زور،مصنف کی جا بجا مداخلت اور اپنے تاثرات سے واقعہ دور ہونے کے سبب بیانیے بھی تنزلی کا شکار ہو گئے یا غائب ہوتے گئے اور یوں بعض نقادوں نے بیانیے کی موت کا اعلان کردیا۔فکشن میں بیانیے کے تنزل کے بعد ایک بار اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس بھی ہونے لگا۔ڈاکٹر قمر رئیس کے بقول جدید فیشن پرستی سے آزاد ہو کر فکشن نگاروں نے آزاد فضا میں سانس لی تو بیانیہ کی واپسی کے امکانات پھر سے ظاہر ہونے لگے۔جدید فیشن پرستی سے ان کی مراد یہ ہے کہ فکشن میں بیانیہ کو کم سے کم کرنے کا رجحان ایک فیشن بن کر اُبھرا تھا لیکن ایک بار پھر بیانیے کی طرف فکشن نگاروں نے رجوع کر لیا ہے۔فکشن میں قصہ یا کہانی ایک بیانیے کے ذریعے پیش کی جانے لگی ہے۔

فکشن میں بیانیے کو گوپی چند نارنگ نے بھی نمایاں کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ:''بیانیہ تو فکشن کی زینت ہے''۔ بیانیہ کے نظریات پر تنقیدی کام کرنے والوں میں روسی نقاد ولادمیر پروپ کا نام بھی اہم ہے جس نے بیانیہ کو پر اثر قرار دیا ہے۔اردو ادب میں بیانیہ پر تنقیدی مباحث کرنے والوں میں گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام اہم ہیں۔

اردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد کا نام ان کی ناول نگاری کے حوالے سے اہم ہے۔انہیں اردو کا پہلا ناول نگار بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔انہوں نے سات ناول لکھے۔ ان کا پہلا ناول مراۃ العروس ہے جس میں انہوں نے تہذیب و اخلاق کی اصلاح کے لیے مختلف بیانیے پیش کیے ہیں۔خواتین کی سماجی و تعلیمی پسماندگی بھی ان کا خاص موضوع تھا۔ناول میں دو بہنوں اکبری اور اصغری کے کرداروں کے ذریعے ان کے مزاج و عادات میں فرق کو اپنے بیانیوں کے ذریعے نمایاں کیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناولوں کے موضوعات معاشرتی مسائل سے جڑے ہوئے ہیں جن کو بیانیوں کے ذریعے خوب نمایاں کیا گیا ہے۔ان کا ناول توبۃ النسوح بھی ایک اصلاحی ناول ہے۔تربیت اولاد کے موضوع پر اس ناول میں نذیر احمد نے والدین کو بچوں کی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور یہ اصلاحی مقصد اپنے افسانوی بیانیوں کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کا ایک اور نصیحت آموز ناول فسانہء مبتلا ہے جس میں تعدد ازدواج کی برائیوں کو نمایاں کرنے کی خاطر پر اثر بیانیوں سے کہانی کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ان کا سب سے مقبول ناول ابن الوقت ہے۔اس ناول میں بھی معاشرتی مسائل کو واضح کرنے کی طرز سے مختلف کرداروں اور قصے کہانیوں کو بیانیوں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں نہ صرف ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو حقیقی معلوم ہوتے ہیں بلکہ مختلف بیانیوں کے ذریعے ان کی شخصیت کو بھی نمایاں کرکے کہانی کو پراثر بنایا ہے۔ان کے بعد عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کو بھی بیانیوں کے حوالے سے اہمیت حاصل ہے۔عبدالحلیم شرر کے بیشتر بنانیے تاریخی نوعیت کے ہیں۔ وہ مسلمان قوم کی عظمت کو افسانوی بیانیوں کے ذریعے نمایاں کرتے ہیں۔ وہ قاری کو ایک نیا جوش اور جذبہ دلاتے ہیں اس لیے ان کے ایسے بیانیے اپنے مقصد کے لحاظ سے صاف اور واضح ہیں۔ رتن ناتھ سرشار کے ناولوں خاص طور سے فسانہ آزاد، کامنی، کندن، جام سرشار میں مضبوط کردار تخلیق کرکے پر اثر بیانیوں کے ذریعے کہانی کو ترتیب دیا گیا ہے۔

افسانوی بیانیوں کی روایت میں قراۃ العین حیدر کے ناولوں کو بھی اہمیت حاصل ہے۔پاکستان میں لکھے گئے ان کے ناولوں میں ان کے تخلیق کردہ کردار اور ان کے افسانوی بیانیے جاگیرداروں، نودولتیوں اور ایک

استحصال معاشرے کے بہت سے کرداروں کی کہانی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ان کی تصانیف کی رفتار، چائے کے باغ،آگ کا دریا، پکچر گیلری، چاندنی بیگم،آخر شب کے ہمسفر میں انسانوی بیانیے واقعات کو مربوط بناتے اور کہانی کو پراثر انداز میں آگے بڑھاتے ہیں۔

عزیز احمد کے ناولوں ''ہوس'' ''مرمر اور خون'' ''گریز'' آگ'' کے تاریخی نوعیت کے بیانیے دلچسپ انداز میں کہانی کو آگے بڑھانے اور قاری کی بصیرت پر حاوی ہوتے ہیں۔ان کے بیانیوں میں ان کا تصور تاریخ و تہذیب خود کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ناول ''گریز'' جس کا اصل بیانیہ دو تہذیبوں کے تاریخی و سماجی رویوں کو نمایاں کرتا ہے۔نعیم جو ایک مشرقی کردار ہے مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ مغرب جا کر مغربی تہذیب کو بھی پسند کرنے لگتا ہے۔جب کہ بلقیس مشرقی اقدار ہی پر قائم رہتی ہے۔

عزیز احمد کا ناول ''آگ'' اپنے بیانیوں میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور مہاجنی نظام کی خرابیوں پر تنقید کرتا ہے۔ان کے ایک اور ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں قوموں کے عروج و زوال کو بیانیوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

انتظار حسین کے ناولوں میں مکالموں سے بیانیوں کا کام لیا گیا ہے۔البتہ واضح اور مضبوط بیانیے بھی ان کے ناولوں میں کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ان کے ناول ''بستی'' کے بیانیے ہجرت سے متعلق ہیں۔آزادی کے بعد کے حالات، تارکین وطن اور دیگر سماجی مسائل ان کے افسانوی بیانیوں کے ذریعے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے ایک اور ناول ''تذکرہ'' کا بیانیہ ہندو مسلم اتحاد اور تحریک خلافت سے متعلق ہے۔''چاند گہن'' ''آگے سمندر ہے'' بھی افسانوی بیانیوں سے مرتب کی ہوئی طویل کہانیاں ہیں۔

عبداللہ حسین کے ناولوں اُداس نسلیں، باگھ، قیداور رات کے افسانوی بیانیے مختلف واقعات کے ربط اور کہانی کی جزئیات کے تسلسل کے ساتھ ساتھ کہانی کے معنوی ارتقاء کا باعث ہیں۔ان کے ناولوں میں جہاں تاریخ و تہذیب بیان کی گئی ہے ان میں واضح بیانیوں کے ذریعے تاریخی وتہذیبی عناصر کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔وہ تاریخی واقعات اور تہذیبی حالات کو بیانیے کی شکل میں قاری کے لیے پیش کرتے ہیں۔ناول اُداس نسلیں جو برصغیر کی تاریخ کے ایک دور کا احاطہ کرتی ہے، کئی نسلوں کے سماجی اور سیاسی رویوں اور رجحانات کا احاطہ کرتا ہے۔ناول باگھ میں باگھ ایک ایسا درندہ ہے جو بلی کی نسل سے ہے لیکن شیر کے امتزاج سے وہ خوف کی ایک علامت

ہے۔ناول نگار نے افسانوی بیانیوں کے ذریعے باگھ کا خوف پورے ناول میں طاری کردیا ہے۔ناول قید میں ضیاء کے مارشل لاء دور کے ایک سچے واقعے کو موضوع بنا کر مختلف بیانیوں میں پیر پرستی اور جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

ناول ''نادار لوگ'' کے بیانیے تقسیم سے قبل مسلم سکھ معاشرت میں باہمی میل جول اور اخوت کو نمایاں کرتے ہیں تو آزادی کے دوران فسادات،ہجرت اور مہاجرین کے مسائل کو بھی ابھارتے ہیں۔ناول میں تاریخی بیانیے بھی پیپلز پارٹی کے ارتقاء اور پہلی عوامی حکومت کے کھوکھلے نعروں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ہر ناول کا بیانیہ دوسرے سے مختلف اسلوب رکھتا ہے۔ ناول پیار کا پہلا شہر کے بیانیے جاندار ہیں تو ناول بہاؤ کے بیانیوں میں وادہ سندھ کی تہذیب کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔بہاؤ کا بیانیہ وادی سندھ کے قدیم دریا سرسوتی کے خشک ہو کر معدوم ہونے پر مشتمل ہے۔ہزاروں سال کی قدیم تہذیب کو پراثر بیانیوں ہی کے ذریعے قاری کے سامنے لا کھڑا کیا گیا ہے۔

اردو ناولوں میں بیانیے کی روایت ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے شروع ہو کر عہد حاضر کے ناول نگاروں عبداللہ حسین اور مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں تک کسی واقعے ،مشاہدے یا مطالعے کو کہانی کے انداز میں پیش کرنے کی صورت میں موجود ہے۔دراصل بیانیہ ہی بکھرے واقعات اور مشاہدات کو کہانی کو مربوط بنانے اور ان کو کہانی میں ڈھالتے ہیں۔

بیانیہ دراصل کسی تحریر یا فن پارے میں کوئی واقعہ یا مختلف واقعات کی ایک ترتیب ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے تہہ در تہہ کھلتے ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بیانیہ اسلوب میں مصنف کسی واقعہ،قصہ،مطالعہ یا مشاہدے کو کہانی کے انداز میں پیش کرتا ہے اور اس میں کسی بھی تحریر کو جائز تصور کیا جائے گا۔بیانیہ میں مصنف کوئی واقعہ یا قصہ کرداروں ،مکالموں یا مختلف مناظر کے ذریعے پیش کرسکتا ہے یا پھر وہ کسی فن پارے میں بیانیہ کا پیرایہ تیار کرنے کے لئے داخلی خود کلامی کا سہارا بھی لے سکتا ہے۔بیانیہ جہاں رومانوی یا حقیقت پسندانہ ہوسکتا ہے تو دوسری طرف اس میں علامت اور تجرد کا استعمال بھی جائز ٹھہرتا ہے۔

مختصراً بیانیہ سے مراد ہر وہ تحریر ہے جس میں کوئی واقعہ یا واقعات بیان کیے جائیں۔بیانیہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس میں جو واقعات بیان ہوں وہ لامحالہ فرضی ہوں اگر یہ شرط لگائی بھی جائے تو بہت سے

ناول بیانیہ کی سرحدوں سے باہر ٹھہریں گے۔اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ بیانیہ کو واقعات سے غرض ہے چاہے واقعات فرضی ہوں یا سراسر حقیقت پر مبنی ہوں اور نہ ہی اس سے یہ فرق پڑتا ہے کہ وہ واقعات کب ،کہاں اور کیسے اخذ کئے گئے ہیں۔اگر ادبی روایت پر نظر ڈالیں تو بہت سے ایسے ناول افسانے میری نظر سے گزرے ہیں کہ جن میں حقیقت پسندی سے کام لیا گیا ہے یا پھر سچ اور جھوٹ کو کچھ اس قدر گھلا ملا کر پیش کیا گیا ہے کہ اس میں جھوٹ اور سچ کی تمیز اور فرق کرنا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سی بات ہے۔ اور پھر ایسے واقعات اور قصے بھی جو ہماری مذہبی کتابوں میں مذکور ہیں جن کی صدیوں پرانی روایات ہیں اور جن کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ اور مکمل یقین رہا ہے کہ وہ واقعات اور قصے سرتاسر سچ اور مبنی بر حقیقت ہیں پھر کیا ہم ان کو بیانیہ سے باہر کا حصہ مان لیں جو اب یقیناً نفی میں آئے گا کیونکہ بیانیہ محض واقعہ یا واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔

اردو ادب میں ناولوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ افسانوی بیانیہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے شروع ہوتا ہے جو کہ اب تک جاری ہے۔نذیر احمد کے ہاں افسانوی بیانیہ موثر انداز میں ملتا ہے کیونکہ مصنف نے اپنے ناولوں میں کہانی کو بیان کرنے کے لئے دیگر مصنفین کے برعکس نہ تو فضول کے مکالموں سے کام لیا ہے کہ جس سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو اور نہ ہی لمبی تمثیلوں کا سہارا لیا ہے۔اسی وجہ سے اردو ناول نگاری میں افسانوی بیانیوں کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر جاتا ہے۔یہی نہیں بلکہ تاریخ میں دپٹی نذیر احمد کا ایک اہم مقام ہے اور اردو ادب کے پہلے ناول نگار بھی کہلاتے ہیں۔اگر چہ مصنف نے صرف سات ناول لکھے مگر ان سات ناولوں نے ناول نگاری کے میدان میں اس دور کے دیگر ناول نگاروں کی فن ناول نگاری کی تخلیق میں ایک واضح فرق ڈال دیا۔ان کے زیادہ تر ناولوں کے بیانیے معاشرتی اصلاح سے متعلق ہیں۔اگر ان کے بعد عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے ناولوں میں بستی،تذکرہ،چاند گہن،آگے سمندر ہے شامل ہیں۔ان کے ناولوں سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نہایت روشن خیال اور لبرل روایات کے حامی ہیں۔ان کے ہاں اکثر ناولوں کے چھوٹے موٹے بیانیے مجموعی لحاظ سے قوم و ملی جدوجہد آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کے خوگر دکھائی دیتے ہیں۔جبکہ انکو شتر بے مہار آزادی پسند ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔بعد کے آنے والے ناول نگاروں میں عبداللہ حسین کا نام آتا ہے جو کہ ایک نامور اور معروف و مقبول ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔انکے

ناولوں کو پختہ اور معنی خیز کہا جا سکتا ہے۔ناول تو ان کے سب ہی اچھے ہیں مگر بلحاظ بیانیہ انکا ناو اُداس نسلیں ایک طویل مگر جامع ناول ہے۔اسی ناول ہی کی وجہ سے مصنف شہرت کی بلندیوں پر جا پہنچا۔ان کے تمام ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی لمبی فہرست دیکھی جا سکتی ہے۔انکے ناولوں میں تاریخی موضوعات بکثرت دیکھے جا سکتے ہیں۔انکے دیگر ناولوں میں باگھ،قید،رات،نشیب(کہانیوں کا مجموعہ)اورنادار لوگ شامل ہیں۔انکے ہاں تقریباً تمام ناولوں میں بیانیہ انداز اسلوب ملے گا۔اس کے علاوہ انکے ناولوں میں تاریخی موضوعات واضح دیکھے جا سکتے ہیں جس میں تاریخی واقعات کو انتہائی اعلیٰ اور موثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے ۔آخر میں موجودہ صدی کے سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کا نام آتا ہے جس نے سفر ناموں کے میدان میں سکہ جمانے کے بعد ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور آتے ساتھ ہی ناول نگاری کے میدان میں تہلکہ مچا دیا۔جہاں انکے سفر ناموں نے انکی شہرت میں اضافہ کیا وہاں ساتھ ہی ساتھ انکے ناولوں نے انکی شہرت میں چار چاند لگادیئے۔مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں سرفہرست ناول راکھ ہے جو تاریخی نوعیت کا ناول ہے انہوں نے کئی ناول لکھے مگر ہر ایک کا بیانیہ اسلوب دوسرے ناول کے اسلوب بیان سے قدرے مختلف رہا ہے جو اپنے بیانیوں کے حوالے سے شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بہاؤ ،اور پھر ایک لائن لگ گئی جن میں راکھ جیسا تاریخی ناول بھی شامل ہے۔مختصراً یہ کہ ان کے ہاں ہر طرح کے ناول تاریخی، مذہبی ،معاشرتی با آسانی لکھے گئے ہیں۔ان کا ہر ناول موضوع اور کہانی کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت کا حامل دکھائی دیگا۔جس سے ان کی شخصیت کو بخوبی پرکھا جا سکتا ہے۔

اس باب میں افسانوی بیانیہ اورمختلف ناول نگاروں کے ناولوں میں افسانوی بیانیوں کی روایت پراجمالی روشنی ڈالنے کے بعد اختتامیہ کے طور پر تجزیہ پیش کیا گیا۔ میرا مقصد ہرگز کسی ناول نگار کے ناولوں کو ترجیح دینا نہیں بلکہ اصل مقصد ان ناولوں میں افسانوی بیانیہ کو جاننے اور اس کا مطلب واضح کرنا تھا۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول راکھ کے مختلف بیانیے ہماری پچاس سالہ قومی تاریخ کے اہم واقعات سے عبارت ہیں۔ان میں تقسیم ہند سے قبل کی سماجی و سیاسی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی ہے اور تقسیم کے وقت بدآمنی ،قتل و غارت گری اور ہجرت کے واقعات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔آزادی کے حصول کے بعد پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کی منظرکشی بھی کی گئی ہے۔اور جدید عہد کے پاکستان کے حالات و واقعات بھی مختلف بیانیوں کا موضوع بنایا گیا ہے۔

راکھ کے پلاٹ میں لاہور اور اس کی کچھ تاریخی عمارتیں بھی ہیں اور ان عمارتوں میں رہنے والے لوگوں کا طرز زندگی، روزمرہ کے مشاغل، عادات واطوار اور سماجی رویوں کو بیانیوں میں پیش کیا گیا ہے جیسے لکشمی منشن اور گوالمنڈی کے بارے میں مصنف نے ایک بیانیے میں لکھا ہے کہ ان دونوں مقامات پر دو الگ دنیائیں آباد تھیں۔ انہوں نے نوجوان جو تھڑوں پر بیٹھے رہتے ہیں اور جو کرکٹ کھیلتے ہیں ان کی عادات ونفسیات کو بیانیون کے ذریعے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ لکشمی منشن میں رہائش پذیر لوگوں کے علیحدہ علیحدہ مذاہب کے باوجود ان میں باہمی اخوت اور محبت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مصنف کے بقول منشن دراصل ایک خاندان کی حیثیت رکھتا تھا۔اس میں مسلمان، ہندو، پارسی اور سکھ سبھی آباد تھے اور سب کے حقوق برابر تھے۔اس بیانیے میں ان لوگوں میں کوئی تفرقہ اور سماجی اونچ نیچا نفرت کا ماحول نہیں دکھایا گیا۔

راکھ کے وہ بیانیے بہت اہم اور پراثر ہیں جو تقسیم کے وقت فسادات سے ہیں ان فسادات میں مسلمان اور ہندو دونوں اقوام کو زبردست جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔کامونکی ریلوے اسٹیشن پر قتل وغارت کا بیانیہ اس بھیانک صورتحال کو نمایاں کرتا ہے جس کا سامنا ہجرت کرنے والوں کو کرنا پڑا تھا۔ریلوے اسٹیشن جسے مسافروں کے لئے بنایا گیا تھا بقول مصنف کھلی قبروں کا نظارہ پیش کررہا تھا۔کیونکہ مسافروں کو اتنی بے دردی سے قتل کیا گیا تھا کہ کئی دنوں تک ان کی لاشیں پڑی رہنے کے باعث بدبودار ہو چکی تھیں۔وقت نے ایسی بھیانک صورتحال کو مزید موثر بنانے کی خاطر انسانوں کے ساتھ ساتھ کتوں کی حرکات وسکنات کو بھی اپنے بنانیے کا حصہ بنایا ہے۔لاشوں پر گھومنے پھرنے والے ایک کتے کا حال یوں رقم کیا ہے کہ اس سڑاند میں سے اپنے وزن سے زیادہ انسانی لاش کو گھسیٹ کر ایک طرف لے جا رہا تھا۔

مصنف نے لاہور کے اہم مقامات اور وہاں کی زندگی کی تصویر کشی کرنے کی غرض سے جو بیانیے تحریر کیے ہیں وہ انکھوں کے سامنے لاہور کا قدیم نقشہ اُبھار دیتے ہیں۔مغل شہنشاہ اورنگزیب کے بیٹے معظم شاہ سے منسوب شاہ عالمی دروازے کی تاریخی حیثیت بھی مصنف نے بیان کی ہے تو فسادات کے دوران یہاں ہونے والی تباہ کاریوں کو بھی اپنے بیانیوں کا حصہ بنایا یہ۔ ایسے بیانیے ماضی کے واقعات کو زندہ واقعات بنا کر پیش کرتے ہیں۔بیانیے کا ایک ایک کردار چلتا پھرتا کھائی دیتا ہے۔ایک ایک واقعہ انکھوں کے سامنے یوں پھیل جاتا ہے جیسے یہ ماضی کا واقعہ نہیں بلکہ حال میں جاری واقعہ ہے۔

شاہ عالمی میں آگ لگانے اور ہندوؤں کے مکانات اور دکانیں جلانے کے واقعات بیانیوں میں بڑے موثر انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ایک بیانیے میں بتایا گیا ہے کہ ہندو شاہ عالمی دروازے کو بند کر کے محصور ہو چکے تھے۔ایک مجسٹریٹ نے چند جانبازوں کو زیر زمین گندے نالے کے ذریعے اندر پہنچایا اور انہوں نے مکانوں اور دکانوں کو آگ لگادی۔ایسے بیانیے ایک متحرک فلم کی طرح محسوس ہوتے ہیں اور ان بیانیوں کی یہی خوبی راکھ کو ایک کامیاب ناول بناتی ہے۔

نـــادار لـوگ تقسیم سے قبل کی زندگی کا بھی احاطہ کرتا ہے،تقسیم کے دوران کے حالات و واقعات کو بھی مختلف بیانیوں کے ذریعے نمایاں کرتا ہے اور تقسیم کے بعد ملک کے سیاسی حالت اور مشرقی پاکستان کی لیجدگی کا بھی احاطہ کرتا ہے۔عبداللہ حسین نے ایک ایسی نادار قوم کی کہانی بیان کی ہے جو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے بعد بھی مختلف قسم کی سازشوں کا بھی شکار رہے اور بدعنوان طبقات کے ہاتھوں ان کا استحصال جاری رہا۔

ناول میں تقسیم ہند سے قبل کے سماجی حالات کی تصویر کشی جن بیانیوں میں کی گئی ہے وہ پر اثر ہیں۔ مصنف نے مسلم سکھ معاشرے میں امن و آشتی اور باہمی اخوت کو مختلف واقعات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ مثلاً امرتسر کے نواح میں کبیر سنگھ والا نامی گاؤں میں اکثریتی آبادی سکھوں کی ہے۔مسلمانوں کا صرف ایک گھرانہ ہے لیکن ان میں کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے۔سکھ برادری مسلمان گھرانے کی ہر غمی خوشی میں شامل ہے اور جب سیاسی حالات کشیدہ ہو جاتے ہیں اور فسادات پھوٹ پڑتے ہیں تو کبیر سنگھ والا کے سکھ اس مسلمان گھرانے کی حفاظت کرتے ہیں۔مسلمان گھرانے کو بچانے والے بھی سکھ ہیں جبکہ آنے والے بلوائی بھی سکھ ہیں لیکن مسلمان نسل درنسل یہاں رہتے آئے ہیں اس لیے سکھ ان کی حفاظت کو اپنا سماجی فریضہ سمجھتے ہیں۔

ناول میں تقسیم کے دوران ہجرت کے واقعات کو بھی بیان کیا ہے اور ہجرت کے دوران فسادات اور مظالم کی داستانیں بھی رقم کی ہیں اور آزادی کے بعد ملکی انتظام میں بے قاعدگی اور بدعنوانیوں کو بھی اپنے بیانیوں کا حصہ بنایا ہے۔مصنف نے اس حوالے سے ہجرت کر کے آنے والوں کے مسائل کی بھی افسانوی انداز میں نشاندہی کی ہے۔اپنے مکانات،دکانیں اور زمینیں چھوڑ کر آنے والوں کو یہاں سر چھپانے کے لیے جگہ کا ملنا مشکل ہو رہا تھا جبکہ ناجائز طریقوں سے یہاں ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں پر قبضے

کے واقعات کو بھی مصنف نے کھل کر بیان کیا ہے۔

کسان یونینز اور بھٹہ خشت مزدوروں کی زبوں حالی کو بھی ناول میں نمایاں کیا گیا ہے۔ بھتہ مالکان کے مظالم نے مزدوروں سے زندگی کا حق ہی چھین لیا ہے۔ غریبوں اور مزدوروں کے حالات کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ناول کے بیانیے سیاسی حالات پر بھی مبنی ہیں۔ایک جلسے میں بنگال کے مولانا بھاشانی کی آمد اور استقبال کا منظر بیان کیا گیا ہے۔اس طرح غریبوں اور مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کا نعرہ لگا کر وجود میں آنے والی پیپلز پارٹی کے ارتقائی ادوار کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔سیاسی حالات و واقعات کو مختلف بیانیوں کا حصہ بنانے میں فوجی ڈکٹیٹروں کے کردار اور سیاست پر ان کے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی جدوجہد اور عوامی انداز کو بھی بیانیوں میں پیش کیا گیا ہے۔

سیاسی حوالوں سے سقوط ڈھاکہ ایک اہم حوالہ ہے۔مشرقی پاکستان میں بانی تحریک کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کے منفی سیاسی رویے کو بھی نمایاں کیا گیا ہے ۔مصنف نے سیاسی لیڈروں کی اقتدار کے لیے رسہ کشی کو بھی موضوع بنایا ہے۔

۱۹۷۱ کی جنگ اور اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد عام پاکستانیوں کے جذبات و احساسات کو بھی ناول نگار نے خوب نمایاں کیا ہے اور اس کے لیے پھر اثر افسانوی بیانیے رقم کیے ہیں۔وہ لوگوں کی کیفیت کو پر اثر الفاظ میں نمایاں کرتے ہیں۔

نادار لوگ سماجی اور معاشرتی حوالے سے بھی ایک کامیاب ناول ہے اور سیاسی حوالوں کے باعث اس کی تاریخی اور سیاسی اہمیت بھی قائم ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ اور عبداللہ حسین کا ناول نادار لوگ نہ صرف ایک ہی زمانے میں منظر عام پر آئے بلکہ ان دونوں کا تاریخی پس منظر اور زمانہ بھی تقریباً ایک سا ہے۔دونوں میں قیام پاکستان کے وقت کے سیاسی و سماجی حالات،فسادات اور قیام کے بعد مہاجرین کے مسائل اور پاکستان کے مسائل مشترک ہیں۔دونوں ناول نگاروں کے بیانیے مختلف ہیں لیکن پس منظر ایک ہے۔

نادار لوگ میں پاکستانی معاشرہ نمایاں ہے۔ناول کے بیانیوں میں محبت،سیاست اور تاریخ کے واقعات ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ملک کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو مختلف بیانیوں میں مختلف حوالوں سے پیش

کیا گیا ہے۔راکھ میں بھی ملک کی سیاسی زندگی کے کئی پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔ناول ہمارے ملک کی پچاس سالہ زندگی کے عروج و زوال کے مختلف مراحل کو ظاہر کرتا ہے۔

آزادی کے وقت کی مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترک سماجی زندگی کو دونوں ناول نگاروں نے مختلف بیانیوں میں نمایاں کیا ہے۔راکھ میں لکشمی منشن میں مسلمانوں، پارسی ، ہندو اور سکھوں کی مشترک معاشرت دکھائی گئی ہے۔جب کہ نادار لوگ میں امرتسر کے نواح میں کبیر سنگھ والا گاؤں میں سکھوں کی آبادی میں صرف ایک مسلمان گھرانے کی پر امن زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔دونون ناول نگاروں نے متحدہ ہندوستان کی سماجی زندگی کو غیر جانبداری سے بیان کیا ہے ۔اسی طرح تقسیم ہند کے دوران فسادات کے واقعات کو بھی دونوں ناول نگاروں نے غیر متعصّبانہ انداز میں بیان کیا ہے۔دونوں ناول نگاروں نے مذہب اور وطن کی محبت سے زیادہ تمام حقائق کو انسانی حوالے سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ایسے بیانیوں سے دونوں ناول نگاروں کی غیر جانبداری اور تاریخ کی گہرائی تک رسائی کا پتہ چلتا ہے۔

تقسیم کے وقت فسادات کی منظر کشی دونوں ناول نگاروں نے اپنے اپنے انداز اور اسلوب میں کی ہے۔نادار لوگ میں فسادات،تباہی اور بربادی کے مناظر راکھ کے مقابلے میں کم مگر اثر کے لحاظ سے پر اثر ہیں۔نادار لوگ میں انسانی مصائب و مشکلات کو ضرور نمایاں کیا گیا ہے لیکن فسادات میں انسانی تباہی اور املاک کی ایسی بربادی نہیں دکھائی گئی جو راکھ میں ہے ۔راکھ میں ہندو مسلم اقوام کی تباہی کو بیان کیا گیا ہے۔

دونوں ناولوں میں فسادات کو سچائی کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔فسادات سے متعلق بیانیے حقیقت پسندی کا ثبوت ہیں۔راکھ میں شاہ عالمی کی تباہی کے دوران جیالوں کو اس بات پر خوشی کا اظہار کرتے دکایا گیا ہے کہ یہاں لال مسجد کو آگ نے چُھوا تک نہیں تھا لیکن مصنف اس بیانیے میں یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ شاہ عالمی چوک میں مندر بھی آگ سے بچ گیا تھا۔

ایسی ہی حقیقت پسندی نادار لوگ میں بھی نمایاں ہے۔کبیر سنگھ والا گاؤں میں جگت سنگھ اور جسونت سنگ ایک یہ مسلمان گھرانے کو بلوائیوں سے بچانے کی خاطر یعقوب اعوان کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔

دونوں ناولوں میں پاکستان کے سیاسی شب و روز کو مختلف بیانیوں میں قلم بند کیا گیا ہے۔ راکھ میں پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت اور ایک جلسے کا منظر بیان کیا گیا ہے تو نادار لوگ میں بگال کے لیڈر شیخ مجیب الرحمان کی شخصیت ،انداز خطاب اور سیاسی نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بھی دونوں ناول نگاروں کے سیاسی بیانیے یکساں ہیں۔دونوں ناولوں میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کے نظریات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے اور مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن اور قیام بنگلہ دیش کے حالات و واقعات بھی بیانیوں کا حصہ ہیں نادار لوگ میں اس کمیشن کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے محرکات جاننے اور ذمہ داروں کا تعین کرنے کی خاطر بنایا گیا تھا۔

دونوں ناولوں میں پاکستان کی بیوروکریسی اور افواج سے متعلق بیانیے شامل ہیں۔دونوں ناول نگار نہ تو فوج کے سیاسی کردار کی حمایت کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے عسکری کردار سے مطمئین ہیں،خاص طور پر سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے دونوں ناول نگاروں نے فوج کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔راکھ میں مشرقی پاکستان میں فوج کے افسران کے غیر ذمہ دارانہ رویے کو بہت کرب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔جیسے کرنل خان مسلمان بنگالیوں کو ہندو سمجھ کر بے گناہ قتل کر دیتا ہے۔نادار لوگ میں بھی مشرقی پاکستان کے حوالے سے آرمی کے کردار کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔نہ صرف مشرقی پاکستان میں فوج کی شکست کو بلکہ پاکستان کی تاریخ کے مختلف ادوار مین سیاست میں فوج کی مداخلت اور فوج کی اخلاقی حیثیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔راکھ کی طرح نادار لوگ میں بھی مشرقی پاکستان میں فوج کے بعض افسران کے غیر مناسب رویے کو نمایاں کیا گیا ہے۔جیسے:فوجی افسران اپنے ماتحتوں سے استفسار کرتے کہ آج کتنے بنگالیوں کو مارا ہے۔آرمی والے لوٹ مار کرتے رہے اور خود جنرل نیازی نے کہا کہ جو اُٹھا سکتے ہو اُٹھا لو۔

دونوں ناول نگاروں نے سانحہ مشرقی پاکستان کو ایک عظیم سانحے کے طور پر رقم کیا ہے۔ملک کے سیاسی حالات کے حوالے سے دونوں ناول نگاروں نے سیاسی مدوجزر کی تہہ میں اتر کر حقائق تلاش کیے اور بیان کیے ہیں۔

عبداللہ حسین اور منستنصر حسین تارڑ منجھے ہوئے ناول نگار ہیں۔ان کا ذاتی مطالعہ بھی وسیع ہے اور تاریخ و تہذیب کا تصور بھی وسیع اور ہمہ گیر ہے۔دونوں ناول نگار قدیم تاریخ و تہذیب کی مختلف تہوں میں اترنے کا فن بھی جانتے ہیں ار جدید سماجی و سیاسی زندگی کے مخفف زاویوں پر بھی ناقدانہ نگاہ رکھتے ہیں۔دونوں ناول نگاروں کے افسانوی بیانیے ایک خاص عہد میں ایک خاص واقعے یا حالات کو اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ احمد، رضیہ فصیح، صدیوں کی زنجیر، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۸ء

۲۔ احمد، عتیق، مضامین پریم چند۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۱ء

۳۔ احمد، عزیز، ایسی بلندی ایسی پستی۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۹۶ء

۴۔ احمد، عزیز، گریز۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۱ء

۵۔ احمد، عزیز، شبنم۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۲ء

۶۔ اختر، سہیل، تنقیدی اور تحقیقی جائزے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء

۷۔ امجد، رشید، شاعری کی سیاسی و فکری روایت۔ لاہور: کوٹھی رتن میو ہسپتال، ۱۹۹۳ء

۸۔ بخاری، سہیل، اردو ناول نگاری۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۶۰ء

۹۔ بٹ، نثار عزیز، کاروان وجودم۔ اسلام آباد: احمد اشعر پبلشرز، ۱۹۸۰ء

۱۰۔ پرویز، اطہر، ادب کا مطالعہ۔ لاہور: دبستان ادب۔ سن ندارد

۱۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، تارڑ نامہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۱۲۔ ایضاً، ماسکو کی سفید راتیں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۹ء

۱۳۔ ایضاً، لاہور سے یار قند۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۱۴۔ ایضاً، اے غزال شہر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۱۵۔ ایضاً، الاسکا ہائی وے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

۱۶۔ ایضاً، خاص و خاشاک زمانے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۱۷۔ ایضاً، ہیلو ہالینڈ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

۱۸۔ ایضاً، نیو یارک کے سو رنگ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۱۹۔ ایضاً، مجموعہ مستنصر حسین تارڑ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۲۰۔ ایضاً، پرندے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۲۱۔ ایضاً، غار حرا میں ایک رات۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۲۲۔ ایضاً، منہ ول کعبہ شریف۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۲۳۔ ایضاً، سنہرے الو کا شہر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۲۴۔ ایضاً، نکلے تری تلاش۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۲۵۔ ایضاً، رتی گلی۔ لاہور۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۲۶۔ ایضاً، خانہ بدوش۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۲۷۔ ایضاً، ڈاکیہ اور جولاہا۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۲۸۔ ایضاً، برفیلی بلندیاں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۲۹۔ ایضاً، اندلس میں اجنبی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۳۰۔ ایضاً، پتلی پیکنگ کی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۳۱۔ ایضاً، بے عزتی خراب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۳۲۔ ایضاً، کالاش۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۳۳۔ ایضاً، دیو سائی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۳۴۔ ایضاً، قلعہ جنگی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

۳۵۔ ایضاً، چترال داستان۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۳۶۔ ایضاً، قربت مرگ میں محبت۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

۳۷۔ ایضاً، شتر مرغ ریاست۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۳۸۔ ایضاً، گدھے ہمارے بھائی ہیں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۳۹۔ ایضاً، سنو لیک، لاہور۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۴۰۔ ایضاً، شمشال بے مثال، لاہور۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۴۱۔ ایضاً، نیپال ناگری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۴۲۔ ایضاً، شھپر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۴۳۔ ایضاً، ہزاروں ہیں شکوے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۴۴۔ ایضاً، ہزاروں راستے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۴۵۔ ایضاً، پاک سرائے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۴۶۔ ایضاً، راکھ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۴۷۔ ایضاً، پیار کا پہلا شہر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۴۸۔ ایضاً، کے ٹو کہانی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۴۹۔ ایضاً، دیس ہوا پردیس۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

۵۰۔ ایضاً، پکھیرو۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۵۱۔ ایضاً، سفر شمال کے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۵۲۔ ایضاً، سیاہ انکھ میں تصویر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

۵۳۔ ایضاً، پرواز۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۵۴۔ ایضاً، چک چُک۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء

۵۵۔ ایضاً، جپسی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۵۶۔ ایضاً، ہنزہ داستان۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۵۷۔ ایضاً، بہائو۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

۵۸۔ ایضاً، الو ہمارے بھائی ہیں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

۵۹۔ ایضاً، کارواں سرائے ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء

۶۰۔ ایضاً نانگا پربت۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء

۶۱۔ ایضاً،نکلے تیری تلاش میں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء

۶۲۔ ایضاً، گزارا نہیں ہوتا۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء

۶۳۔ ایضاً، مورت۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء

۶۴۔ ایضاً، سورج کے ساتھ ساتھ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۶۵۔ ایضاً، ہزار داستان۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۶۶۔ ایضاً، خطوط۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۶۷۔ ایضاً، پاک سرائے ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۶۸۔ ایضاً، ایک حقیقت ایک افسانہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۶۹۔ ایضاً، فریب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،

۷۰۔ حسین،عبداللہ،نشیب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء

۷۱۔ ایضاً،باگھ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء

۷۲۔ ایضاً،نادار لوگ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء

۷۳۔ ایضاً،قید۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء

۷۴۔ ایضاً،مجموعہ عبداللہ حسین۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء

۷۵۔ ایضاً،رات۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء

۷۶۔ ایضاً،اداس نسلیں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء

۷۷۔ حسینی،علی عباس،ناول کی تاریخ و تنقید۔لاہور: میری لائبریری،سن ندارد

۷۸۔ حسین،انتظار،بستی ۔لاہور: نقش اول کتاب گھر،۱۹۷۹ء

۷۹۔ ایضاً، تذکرہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۸۰۔ ایضاً، آگے سمندر ہے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

۸۱۔ حیدر، قراۃ العین، میرے بھی صنم خانے۔ لاہور: ۱۹۴۹ء

۸۲۔ ایضاً، سفینہ غم دل۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۴۹ء

۸۳۔ ایضاً، آگ کا دریا۔ لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۹ء

۸۴۔ ایضاً، آخر شب کے ہمسفر۔ لاہور: چوہدری اکیڈمی، ۱۹۷۹ء

۸۵۔ ایضاً، گردش رنگ چمن۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۸۷ء

۸۶۔ حسن، محمد، جدید اردو ادب۔ کراچی: غضنفر اکیڈمی، سن ندارد

۸۷۔ زیدی، شمع افروز، اردو ناول میں طنز و مزاح۔ لاہور: پروگریسو بکس، ۱۹۸۸ء

۸۸۔ سجاد، انور، خوشیوں کا باغ۔ لاہور: قوسین، ۱۹۸۱ء

۸۹۔ سندیلوی، اسلام، ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۴ء

۹۰۔ شیخ، محمد اکرام، آب کوثر۔ راولپنڈی: سروس بک کلب، ۲۰۰۲ء

۹۱۔ صدیقی، شوکت، خدا کی بستی۔ کراچی: مکتبہ نیا راہی، ۱۹۶۲ء

۹۲۔ ایضاً، چار دیواری۔ کراچی: رکتاب، ۱۹۹۱ء

۹۳۔ طارق، امراؤ، معتوب۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء

۹۴۔ عبداللہ، محمد سید، اشارات تنقید۔ لاہور: مکتبہ خیابان، ۱۹۶۰ء

۹۵۔ علی، حجاب امتیاز، پاگل خانہ۔ لاہور: ادارہ تاج و حجاب، ۱۹۸۰ء

۹۶۔ فاروقی، محمد احسن، سنگم۔ لاہور: دی بک کارپوریشن، ۱۹۶۱ء

۹۷۔ ایضاً، نور الحسن ہاشمی، ناول کیا ہے۔ لاہور: درد اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

۹۸۔ ایضاً، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ۔ لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

۹۹۔ فاطمہ،الطاف،نشان محفل۔لاہور: دارالابلاغ،باردوم، ۱۹۷۵ء

۱۰۰۔ ایضاً، دستک نہ دو۔لاہور: فیروز سنز،۱۹۶۵ء

۱۰۱۔ فضلی،فضل احمد کریم، خون جگر ہونے تک۔کراچی: دبستان محدود،۱۹۶۰ء

۱۰۲۔ قاسم،غفور شاہ، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ تا حال۔لاہور: بک ٹاک،۱۹۹۵ء

۱۰۳۔ قدسیہ،بانو، راجہ گدھ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء

۱۰۴۔ محمود،طارق،اللہ میگھ دے۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۵

۱۰۵۔ مستور،خدیجہ، آنگن۔لاہور: کتاب نما،۱۹۶۵ء

۱۰۶۔ ایضاً، زمین،لاہور: ادارہ فروغ اردو،۱۹۸۳ء

۱۰۷۔ مفتی،ممتاز، علی پور کا ایلی۔لاہور: میری لائبریری،۱۹۶۱ء

۱۰۸۔ ایضاً، ایلی اور الکھ نگری۔لاہور: میری لائبریری،۱۹۶۲ء

۱۰۹۔ ناگی۔انیس،دیوار کے پیچھے۔لاہور: خالد بن ولید،۱۹۸۰ء

۱۱۰۔ ہاشمی، جمیلہ،تلاش بہاراں۔کراچی: اردو اکیڈمی،۱۹۷۰ء

۱۱۱۔ ایضاً،دشت سوس،لاہور: رائٹر بک کلب،۱۹۸۳ء